داغ داغ زندگی

احمد صغیر

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اُردو اکادمی، پٹنہ کا مالی تعاون شامل ہے۔

داغ داغ زندگی

(افسانے)

احمد صغیر

DAGH DAGH ZINDAGI

(SHORT STORY)

By

Ahmad Sagheer

Year of Ist Edition 2013

ISBN 978-81-8223-543-4

PRICE Rs. 250/-

نام کتاب : داغ داغ زندگی (افسانے)

مصنف : احمد صغیر

مستقل پتہ : حنیف منزل، کوئلی پوکھر، پولس لائن، گیوال بیگھہ، گیا۔823001 (بہار)

موبائل نمبر۔08084808032 / 09931421834

Email.ID : ahmadsagheer52@yahoo.co.in

صفحات : ۱۶۰

سال اشاعت : ۲۰۱۳ء

تعداد : ۵۰۰

کمپوزنگ : سید فضاالرحمٰن

سرورق : حسن رضا

قیمت : ۲۵۰روپئے

مطبع : کلاسک آرٹ پریس، دہلی

Educational Publishing House

انتساب

اپنی چھوٹی بہنوں

عظیمہ بانو

نازنین پروین

نسیمہ بانو

صبیحہ روحی

اور

شبینہ ناز

کے

نام

ترتیب

مسیحائی

دھیرے دھیرے ماریہ نے آنکھیں کھولیں—'

اُس نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا—— چاروں طرف گہری خاموشی اور بلا کا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔آسمان پر سیاہ بادل مسلط تھے۔ ماریہ نے آس پاس نظریں گھمائیں۔ وہ ایک کیچڑ سے بھرے گڑھے میں پڑی تھی۔اُسکے آس پاس گندے پانی اور کیچڑ کا جماؤ تھا۔اس نے اُٹھنا چاہا تو درد کی لہر پورے جسم میں بجلی کی طرح دوڑ گئی۔اُس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔کئی جگہوں سے خون رس رہا تھا۔کہیں گہرا زخم تھا تو کہیں ہلکا۔وہ اُسی طرح لیٹی رہی۔اس میں اُٹھنے کی سکت نہ تھی۔ لیٹے لیٹے اپنے حواس پر زور ڈالا تو دھیرے دھیرے سب کچھ آئینے کی طرح صاف نظر آنے لگا——

اُس رات ماریہ ایک فوجی گاڑی پر اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ گشت پر تھی کہ اچانک بارودی سرنگ پھٹنے سے گاڑی کے پرخچے اُڑ گئے جس میں اسکے کئی ساتھی مارے گئے تھے یا زخمی ہو گئے تھے اسی اثنا میں مجاہدین کا ایک دستہ وہاں پہنچ گیا تھا۔ وہ زخمی فوجیوں کو مار رہے تھے۔ ماریہ اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر کسی طرح وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔لیکن کچھ ہی دور جانے کے بعد درد کا احساس شدّت سے ہونے لگا تھا۔اس نے درد والے حصےّ کو ٹٹول کر دیکھا اندھیرے میں اسے صاف نظر نہیں آیا لیکن اتنا ضرور پتہ چل گیا کہ کئی جگہوں پر زخم گہرا ہے جہاں سے خون رس رہا ہے۔ وہ کسی محفوظ مقام تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن دور دور تک کوئی پناہ گاہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر یہ اسکا ملک نہ تھا۔ایک طرف دشمنوں کا خدشہ دوسری طرف محفوظ مقام کی تلاش اور تیسری طرف زخموں کی کسک اور ٹیس۔ جہاں تک ممکن ہو سکا وہ خود کو گھسیٹ کر آگے بڑھتی رہی تھی بالآخر اس گڑھے میں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔کافی دیر کے بعد ہوش آیا تو رات نے اپنا سایہ پوری طرح پھیلا دیا تھا——'

ماریہ نے ایک بار پھر زخموں کو ٹٹولا اور سوچا—— اگر زخموں کا علاج نہ ہوا تو پورے جسم میں زہر پھیل جائے گا۔ درد کی شدّت اتنی شدید تھی کہ بہت دور تک جا بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر مجاہدین کا خدشہ۔اس نےبمشکل تمام اپنے جسم کو جنبش دی دھیرے دھیرے خود کو سرکایا مگر زخم میں کھنچاؤ اور درد کی وجہ سے چیخ نکل جاتی۔ وہ درد کو برداشت کرتی رہی۔ چیخ کو دباتی رہی اور گڑھے سے

خود کو باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔اس نے دیکھا تھوڑے فاصلے پر گھروں سے چراغ کی روشنی جھانک رہی ہے۔یہ ایک مختصر آبادی والا گاؤں تھا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹے چھوٹے مکان آباد تھے۔ماریہ کو اُمید کی ایک کرن نظر آئی کہ شائد کوئی اسکی مدد کر دے۔لیکن پھر اس نے سوچا کہ اس اجنبی ملک میں سب اس کے دشمن ہیں۔کہیں کوئی اسے جان سے نہ مار دے۔لیکن پھر دوسری بات ذہن میں آئی کہ اگر زخموں کا علاج نہ ہوا تو چند گھنٹوں میں تو یوں بھی اسکی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔کیوں نہ کوشش کر کے دیکھا جائے۔یہ سوچ کر ماریہ خود کو دھیرے دھیرے آگے بڑھاتی رہی سرد ہوا کے تیز جھونکوں کے باعث اس کی پنڈلیاں برف کی سل کی طرح ہو رہی تھیں۔دل میں کئی طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔جسم رفتہ رفتہ اپنی توانائی کھو رہا تھا۔سردی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور قدم گھسٹتی ہوئی ڈھلان پر چڑھنے لگی۔رات بے حد تاریک تھی اندھیرا بے حد گھنا تھا۔اس کی آنکھیں اس گھپ اندھیرے میں پتھرا کے رہ گئی تھیں۔اس کی دائیں ٹانگ میں ایک ٹیس سی اُٹھی اور اس کے جسم کی ساری رگوں کو کھینچتی ہوئی نکل گئی اُس نے اپنی زخمی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا جہاں سے ابھی بھی خون رس رہا تھا۔وہ اسی طرح گھسٹتی ہوئی ٹیلے پر بنے ایک مکان کے قریب پہنچی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی۔

دھڑام کی آواز سن کر اس گھر کی مکین نے دروازہ کھولا۔دروازہ کھولنے والی ایک عورت تھی جس کا نام طلعت تھا۔اس نے دیکھا دروازے کے سامنے ایک زخمی عورت بے ہوش پڑی ہے۔اسکے بدن پر فوجی لباس ہے جو جہاں تہاں سے پھٹا ہوا ہے۔اس نے بغور اُسے دیکھا۔اُسے سمجھتے دیر نہ لگی کہ یہ امریکی سولجر ہے جو کسی حادثے میں زخمی ہوگئی ہے اور بھاگتی ہوئی یہاں تک پہنچ کر بے ہوش ہوگئی ہے۔اس نے ناگواری سے ماریہ کی طرف دیکھا دھڑام سے دروازہ بند کر دیا اور کمرے میں آ کر ٹہلنے لگی پھر اس زخمی عورت کو ذہن سے جھٹک دیا اور بستر پر دراز ہوگئی۔کچھ دیر پہلے وہ اسی بستر پر لیٹی اپنے شوہر انعام کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اپنی زندگی کے ایک ایک پل کا احتساب کر رہی تھی کہ کل وہ کتنے سکون سے زندگی بسر کر رہی تھی۔پورے ملک میں امن تھا۔اس کا پیار کرنے والا شوہر جب نوکری سے شام کو لوٹتا وہ اس کا انتظار کرتی۔دونوں مل کر کھانا پکاتے اور کھا کر آرام سے سو جاتے۔شادی کو تین سال ہوگئے تھے بچہ کوئی نہ تھا پھر بھی خوش تھے کہ آج نہ کل بچہ ہو ہی جائیگا۔لیکن امریکی حملے نے اس کا سکھ چین چھین لیا تھا۔اب اس کا شوہر دن کو کیا رات کو بھی غائب رہتا۔ہفتے دس دن میں ایک بار آتا۔اس کے کھانے پینے کا بندوبست کر دیتا پھر غائب ہو جاتا۔اب اس کے اندر ایک عجیب سی بے چینی رہتی۔وہ اپنے شوہر کے اندر ایک تبدیلی محسوس کرتی ہے جب اسکی آنکھوں کو دیکھتی تو لگتا ان میں خون اُتر آیا ہے۔چہرہ تمتمایا ہوا جیسے کسی کا خون کر کے آ رہا ہے یا خون کرنے جا رہا ہے۔اب وہ جہادی بن گیا تھا اور امریکی فوجیوں پر گوریلا حملے کرتا تھا۔اب اسکے ہاتھ میں بندوق ہوتی تھی۔

ابھی وہ سوچ کے سمندر میں پھر سے غوطہ لگاتی کہ اچانک اس زخمی امریکی سولجر نے اسکی سوچ کے سمندر میں ایک پتھر پھینکا۔اب طلعت اس کے بارے میں سوچنے لگی۔اگر اس عورت کا علاج نہ کیا گیا تو زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا اور اسکی موت ہو جائے گی۔۔۔اچھا ہے مر جائے تا کہ عراقیوں کا لہو نہ بہائے۔ایک ایک فوجی نہ جانے کتنے عراقیوں کو موت کی نیند سلا چکا

ہے اب اسے بھی موت کی نیند سو جانا چاہیئے۔ غصے کا ایک جھونکا اسکے اندر تک پیوست کر گیا۔ پھر سوچ میں کھنڈت پڑ گئی اور دوسری لہر نے سر اُٹھایا۔ ہمارے پیغمبروں اور صوفیوں نے تو دشمنوں کا بھی علاج کیا تھا اسے بھی معاف کر دیا تھا پھر یہ عورت میرے دروازے پر زندگی اور موت سے لڑ رہی ہے اگر کسی اور جگہ ہوتی تو مجھے پرواہ بھی نہ ہوتی لیکن انسانیت کے ناطے میرا فرض بنتا ہے کہ اسکی مدد کی جائے لیکن پھر اس کے اندر سے کوئی آواز لگاتا ـــــ نہیں اسے مر ہی جانا چاہیئے یہ ہماری دشمن ہے اور دشمن کے ساتھ ہمدردی کیسی؟ یہ ہمارے ملک کی دشمن ہے، ہماری قوم کی دشمن ہے۔ اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں مگر اس کا دل کہتا انسانیت کا بھی کوئی تقاضہ ہے۔

طلعت کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی۔ اس کا دل کہتا اس کی مدد کرنی چاہیئے لیکن اس کے اندر سے ایک آواز ابھرتی، اسے مرنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے ـــــ بہت دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچی۔ طلعت کچھ سوچ کر بستر سے اُٹھی دروازہ کھولا تو دیکھا وہ عورت اسی طرح بے ہوش پڑی ہے۔ خون اس کے جسم سے رس رہا ہے۔ طلعت نے اسے سہارا دیکر اُٹھایا اندر کمرہ میں لے آئی اور بستر پر لیٹا دیا۔ اس کے کپڑے اتارے اور زخموں کا علاج کرنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے ماریہ کو ہوش آنے لگا اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو گھر کے اندر پایا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر زخموں کو دیکھا جہاں پٹی بندھی ہوئی تھی پھر پاس بیٹھی طلعت پر نظر گئی مشکور نگاہوں سے طلعت کی طرف دیکھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''ـــ طلعت اپنی زبان میں پوچھتی ہے۔ ماریہ اتنے دنوں میں کچھ کچھ وہاں کی زبان سمجھنے لگی تھی۔

''ماریہ...... ماریہ ڈی سوزا......'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''تم فوجی ہو؟''ـــ ماریہ نہیں سمجھ پائی ـــ ''آئی مین یو آر سولجر''ـــ طلعت نے انگریزی میں پوچھا۔

''یس''ـــــ ماریہ نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔

''یو آر امریکن؟''ـــ

''یس، آئی ایم امریکن سولجر''۔

تم زخمی کیسے ہوئیں؟

''ہم لوگ اپنی فوجی گاڑی پر گشت لگا رہے تھے کہ بارودی سرنگ پھٹ جانے کی وجہ سے میری گاڑی کے پرخچے اُڑ گئے جس میں میرے کئی ساتھی مارے گئے۔ میں زخمی ہوگئی تھی لیکن بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہوں۔ تم نے میرا علاج کر کے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ بروقت میرا علاج نہ ہوتا تو ممکن تھا میں مر جاتی''ـــــ

طلعت کچھ بولی نہیں، خموشی سے اسے سنتی رہی پھر کچھ دیر بعد دھیرے سے اُٹھی اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ایک پلیٹ میں کچھ کھانے کا سامان لے کر آئی اور فریج سے پانی کی ایک بوتل لا کر اسکے سامنے رکھ دیا۔

''لو کچھ کھالو بھوکی ہوگی ـــــــ کھانا کھا کر سو جانا۔''

طلعت اسکے کمرے سے نکل گئی۔گھر کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بندکیں اور بستر پر آ کر دراز ہوگئی۔

رات جیسے سہم سہم کر گزر رہی تھی۔دم توڑتی ہوئی سیاہی کے پاؤں اُکھڑ رہے تھےلیکن طلعت کے قدم جامد ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کمرہ کے وسط میں کھڑی وسوسوں کی دنیا میں غوطہ زن تھی۔اسکے اندر دھیرے دھیرے ایک خوف سرایت کرتا جا رہا تھاـــــــ اس نے ماریہ کی تیمارداری کر کے کہیں کوئی غلطی تو نہیں کی۔اس نے انسانی ہمدردی کے ناطےاسکی مدد تو کردی لیکن اسکا زخم اتنا گہرا ہے کہ بھرنے میں ابھی ہفتوں لگیں گے۔اگر اسی درمیان میں میرا شوہر آ گیا اور ایک امریکی فوجی کو دیکھ لیا تو فوراً گولی مار دے گا۔مجھ پر الگ ناراض ہوگا کہ میں نے ایک دشمن کو اپنے گھر میں نہ صرف پناہ دی بلکہ اسکی جان بھی بچائیـــ طلعت اپنے کمرے میں ٹہلنے لگی تھی اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔کبھی دل کہتا کہ وہ ماریہ کو ابھی گھر سے جانے کے لئے کہہ دے تا کہ اُسکی جان بچ جائےـــــــ لیکن ماریہ جس حال میں ہے ایک قدم بھی نہیں چل سکے گی کبھی وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگتی کہ خدا کرے میرا شوہر ابھی دو چار دن نہ آئے۔جب ماریہ ذرا بھی چلنے پھرنے کے قابل ہوجائے گی اُسے یہاں سے جانے کے لئے کہہ دیگیـــــــ طلعت کو یہ سوچ کر قدرے اطمنان ہوا کہ اسکا شوہر کل ہی گیا ہے اس لئے ابھی دو چار دن تو یقیناً نہیں آئے گا۔وہ پلنگ پر آ کر آہستہ سے لیٹ گئی۔

صبح صادق طلوع ہوگئی اور سارے ماحول پر سپیدۂ سحر بکھر گیا۔سامنے والی مسجد کے مینار پر سپیدۂ سحر جھک آیا۔ماریہ کی آنکھیں کھل گئیں۔اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔صبح ہو چکی تھی۔وہ اُٹھنا چاہتی تھی لیکن درد کی شدّت ابھی بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ بمشکل پلنگ سے اُٹھی او باتھ روم میں داخل ہوگئی۔چہرے پر پانی ڈالا۔تولیہ سے منہ صاف کیا اور بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔جب تک طلعت اسکے لئے ناشتہ لے کر آ گئی۔اس نے ناشتہ میز پر رکھتے ہوئے کہاـــــــ

''بریک فاسٹ کرلو''

ماریہ نے محبت بھری نگاہ طلعت پر ڈالی۔

''اب زخم کیسا ہے؟''ـــــــ طلعت کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''اسے بھرنے میں ابھی کئی دن لگیں گے''ـــــــ ماریہ نے زخموں کی طرف دیکھا۔

''اور درد کم ہوا؟''ـــــ طلعت نے اسکے درد بھرے چہرے کو بغور دیکھا۔

''کچھ کم ہے''

''یہ ایک کیپسول لے لو درد کم ہو جائے گا۔''ـــــــ طلعت نے ایک کیپسول اسکی طرف بڑھایا۔ماریہ نے کیپسول کو ہاتھ میں لے کر اسکا نام پڑھا پھر کمپنی کا نام پڑھا۔تب جا کر اسے ریپر سے الگ کیا اور پانی کے سہارے نگل لیا۔

''یو آر گریٹ وومن......تم بہت اچھی ہو۔''——مار یہ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

طلعت مسکرائی مگر اپنے شوہر کی یاد آتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی اس نے سوچا——اگر میرا شوہر آ گیا تو میرا سب گریٹ نس نکل جائیگا''—مار یہ کے ناشتہ کر چکنے کے بعد طلعت نے پلیٹ کو سمیٹا اور کمرہ سے نکل گئی۔

دوسری رات تقریباً آدھی رات کے وقت دروازہ پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر طلعت کے اندر ایک خوف سما گیا ۔اتنی رات میں کون آ سکتا ہے۔اس طرح کی دستک تو اسکا شوہر ہی دیتا ہے۔اس نے کانپتی آواز میں پوچھا——

''ک......ک......کون ہے؟''——

''دروازہ کھولو''—

طلعت اپنے شوہر کی آواز پہچان گئی۔ وہ اندر تک کانپ گئی اور ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔نعیم نے اپنی بیوی کے ڈرے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

''کیا بات ہے تم اس قدر ڈری ہوئی کیوں ہو؟''——نعیم نے اسکے چہرے کو اوپر اُٹھایا۔

''کہاں ڈری ہوئی ہوں''——طلعت نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی ۔تبھی ماریہ کے کھانسنے کی آواز آئی۔نعیم کھانسی کی آواز پر چونکا۔

''یہ اندر کون ہے''

''ک......ک......کوئی تو نہیں ہے''—طلعت بری طرح کانپ گئی۔نعیم نے بیوی کے سہمے ہوئے وجود کو بغور دیکھا اور اندر کمرہ میں داخل ہو گیا۔ وہاں ایک امریکی زخمی فوجی کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور اپنی بندوق تان دی۔ ماریہ کو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسکے تحفظ کی ساری چھتیں ٹوٹ گئی ہیں۔طلعت نے بندوق کی نالی پکڑ لی اور گڑ گڑانے لگی۔

''اسے مت مارو۔ یہ زخمی ہے اور مجبور بھی۔زخمی حالت میں میرے دروازے پر آ کر بے ہوش ہو گئی تھی اس لئے میں نے اسکی تیمارداری کر دی اور گھر میں پناہ بھی دی۔مجبور کو مارنے کے لئے خدا بھی منع کرتا ہے''——

''عراق کی پوری قوم بھی مجبور ہے، جسے اسکی قوم ختم کر رہی ہے۔عراق میں نسل کشی ہو رہی ہے اور یہ اس میں شامل ہے کیوں کہ یہ ایک سولجر ہے''——نعیم کی آنکھ میں چنگاری سلگ رہی تھی۔

''لیکن اسے معاف کر دو۔ ہر فوجی اپنے ملک کا وفادار ہوتا ہے اور جو اُسے حکم ملتا ہے وہی کرتا ہے۔ یہ بھی اپنے کمانڈر کے حکم کی تابع ہے۔''

''لیکن خون تو عراقیوں کا بہاتے ہیں''——

''خدا کے لئے اسے معاف کردو''—— طلعت اسکے قدموں سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔نعیم کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا۔ ماریہ مارے خوف کے دیوار سے لگ گئی تھی۔نعیم نے بندوق کندھے پر ٹانگی اور اپنی بیوی طلعت کو کھڑا کیا۔اسکے آنسو پوچھے۔

''تم ایک دشمن کے لئے آنسو بہارہی ہو۔اس لئے کہ تم بھی عورت ہو اور یہ بھی ایک عورت ہے۔میں تمہارے جذبے کی قدر کرتے ہوئے اسکی جان بخش دیتا ہوں لیکن اس سے کہو ہمارے گھر سے فوراً چلی جائے۔''

طلعت نے ماریہ کو نم آنکھوں سے دیکھا—— ماریہ بمشکل اُٹھی اور جیسے ہی کھڑی ہوئی لڑکھڑا کر گر پڑی۔اسکے قدم ٹھیک سے زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔نعیم آگے بڑھا اور اسکا بازو پکڑ کر لگ بھگ گھسیٹتا ہوا دروازے تک لے گیا۔خون پھر سے اسکے زخم سے رسنے لگا تھا اور زمین میں رگڑ کھانے سے وہ پھر سے بے ہوش ہوگئی تھی۔طلعت اسے بے ہوش دیکھ کر نعیم کے سامنے گڑ گڑانے لگی——

''پلیز اسے یہاں کچھ دن رہنے دو۔دیکھو یہ پھر بے ہوش ہوگئی ہے۔جب یہ ذرا بھی چلنے پھرنے کے لائق ہو جائیگی۔چلی جائیگی۔اس مردے کو کیوں مار رہے ہو''——

''لیکن کل جب ٹھیک ہو کر یہاں سے جائے گی تو عراقیوں کا ہی خون بہائیگی——

''کل جب کسی موڑ پر یہ مڈبھیڑ میں ماری جائے گی تو مجھے افسوس نہ ہوگا لیکن ابھی یہ مدد کی محتاج ہے''۔

نعیم نے بے ہوش پڑی ماریہ کو دیکھا اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔طلعت اُسے اُٹھا کر بستر پر لیٹا دی اور اسکا زخم صاف کرنے لگی۔ماریہ دھیرے دھیرے ہوش میں آنے لگتی ہے۔جب وہ ہوش میں آئی تو بہت ڈری ہوئی تھی مگر طلعت نے اُسے ڈھارس بندھائی——

''گھبراؤ نہیں۔میرے شوہر نے تمہاری جان بخش دی ہے۔''

ماریہ نے سینے پر صلیب بنا کر خدا کا شکریہ ادا کیا—— ''تھینکس گاڈ''

طلعت ماریہ کے زخم میں پٹی باندھ کر اپنے کمرہ میں آئی تو دیکھا نعیم کمرہ میں ٹہل رہا ہے۔نعیم اسے دیکھتا رہا۔اب اسکا غصّہ قدرے کم ہو چکا تھا۔

''کھانا نکالوں''—— طلعت اسکے قریب آ گئی۔

''ہاں نکالو۔''——

طلعت کمرہ سے چلی گئی۔کھانے لگا کر پانی کی بوتل میز پر رکھتے ہوئے ایک بار پھر اپنے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہیں''

’’کیوں؟‘‘نعیم نے طلعت کی طرف دیکھا۔

’’اس لئے کہ میں نے ایک دشمن کو اپنے گھر میں پناہ دی اسکی تیمارداری کی‘‘ـــــــ طلعت تھوڑی شرمندہ بھی تھی۔

’’تمہارا دل بہت نرم ہے۔دشمن کو بھی گلے لگا لیتی ہو۔‘‘

طلعت کچھ نہیں بولی۔نعیم کھاتا رہا۔طلعت اسے صرف تکتی رہی کہ شاید ماریہ کے بارے میں کچھ کہے لیکن وہ خاموش رہا اور کھانے سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔

ابھی دونوں میاں بیوی بستر پر دراز ہی ہوئے تھے کہ زوردار دستک کی آواز سن کر دونوں چونک پڑے۔

’’اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟‘‘ـــــــ طلعت نے کہا۔

نعیم نے بندوق سنبھال لی۔طلعت کے اندر بھی خوف سما گیا۔اور دل میں وسوسہ پیدا ہونے لگا کہ کون ہوسکتا ہے۔شوہر کا اشارہ پا کر اُس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔دروازہ کھلتے ہی امریکی فوجی دندنا کر اندر گھس آئے طلعت کے منہہ سے چیخ نکل گئی۔ نعیم نے امریکی فوجیوں کو گھستے ہوئے دیکھ لیا تھا اس نے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ جواب میں امریکی فوجی بھی اندھا دھند گولیاں چلانے لگے۔گولیوں کی آواز سن کر ماریہ بھی لڑکھڑاتے قدموں سے کمرہ کے دروازے تک آئی۔اس نے امریکی فوجیوں کو روکنے کی کوشش کی وہ چلاّ چلاّ کر کہہ رہی تھی کہ اسے نہ مارو ان لوگوں نے میری جان بچائی ہے مگر فوجی نے اس کی ایک نہ سنی اور نعیم پر گولیوں کی بوچھار کر دی۔وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔طلعت اپنے شوہر کی تڑپتی لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔ایک فوجی نے ماریہ کو اپنے کندھے پر اُٹھایا اور آہستہ آہستہ سبھی فوجی گھر سے باہر نکل گئے۔ ماریہ ابھی تک چلاّ چلاّ کر کہہ رہی تھی کہ تم لوگوں نے غلط کیا۔اس نے میری جان بچائی تھی لیکن اسکی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو گئی۔

●●

داغ داغ زندگی

کمرہ میں گھپ اندھیرا تھا۔ عافیہ اس گھپ اندھیرے میں اپنے کمرہ میں لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی۔ رات اداس اور خاموش تھی۔ اداس چاند آسمان کی لامحدود وسعتوں میں یوں پریشان نظر آرہا تھا جیسے زمانے بھر کا غم اس کے سینے کا داغ بن گیا ہو۔

سیاہ داغ.........!

عافیہ کے سینے میں بھی ایسا ہی ایک داغ موجود تھا جسے وہ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتی تھی لیکن وہ سوچتی ——— یہ داغ اس کے وجود پر چسپاں ہے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں دفعتاً وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ نینداس کی آنکھوں سے پرندے کی طرح پرواز کر گئی تھی۔ اس نے کھلی کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا جو خاموش تھا۔ ستاروں کی چادر اوڑھے، چپ سادھے، سہما سہما اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی بات کی بات میں کچھ ہونے والا ہے۔ ابھی لمحہ بھر میں اس کے وجود پر آئٹم بم گرنے والا ہے اور اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے والا ہے۔ اس نے گھبرا کر اپنے شوہر کی جانب دیکھا، وہ گہری نیند سو رہا تھا اگر اس کے شوہر کو حقیقت کا پتہ چل گیا تو اس کی زندگی جہنم بن جائے گی۔ ساری رات وہ چھت پر نظریں جمائے سوچتی رہی۔ دیواروں کو گھورتی رہی۔ ساری رات اسے دور سے آنے والی کسی بھیانک آندھی کا شور سنائی دیتا رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے آسمان کا سرخ گوشہ ڈوبتا ابھرتا رہا۔ ساری رات اس کی دل کی دھڑکنیں انگارے چنواتی رہیں اور وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی بالآخر وہ بے چینیوں کی کشاکش سے تھک کر چور چور ہو گئی اور رات کے تیسرے پہر نیند نے اس کے بے قرار دل پر آہستہ سے ہاتھ رکھ ہی دیا۔

آخر ایسا کیا ہو گیا تھا جو عافیہ کی خاموش زندگی میں تلاطم پیدا کر دیا تھا۔

وسیم کا نیا نیا ٹرانسفر ہوا تھا۔ اجنبی شہر میں کوئی شناسا نہیں تھا لہٰذا دفتر میں جوائننگ کے بعد سب سے اہم مسئلہ مکان کا تھا۔ اس نے کنٹریکٹر سے رابطہ قائم کر کے سرائے محلّہ میں ایک خالی مکان کرائے پر لے لیا اور اڈوانس دے کر اپنی بیوی عافیہ کو لینے چلا گیا۔

ایک ہفتے کے اندر ہی وسیم اور عافیہ کو اندازہ ہو گیا کہ اس محلے میں زیادہ تر مکان طوائفوں کے ہیں۔ بقیہ مکان میں اوباش

قسم کے لوگ آباد ہیں جو ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں' گالی گلوج کرتے رہتے ہیں۔ وہ جلد سے جلد مکان بدل دینا چاہتا تھا لیکن کسی طرح ایک مہینہ تو گزارنا ہی تھا۔ کرایہ جو اڈوانس میں دے رکھا تھا پھر دوسرا مکان ڈھونڈنے میں کچھ وقت تو لگ ہی جائے گا۔ وسیم نے عافیہ کو تاکید کر دیا تھا کہ میرے جانے کے بعد گھر کا دروازہ بند رکھے اور جب میں آجاؤں تو میری شناخت کرنے کے بعد ہی دروازہ کھولے۔

وسیم کے جانے کے بعد عافیہ کسی مرغی کی طرح گھر میں بند ہو جاتی۔ سارا دن وہ بے چین سی گھر میں پھرتی رہتی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک جاتا کہ آخر یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ اس کے باعث بے چینی اور بڑھ جاتی قلبی بے قراری اسے جگائے پھرتی اور اس کا ذہن ذرا دیر بھی ٹھہر کر آرام نہ کر پاتا۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی اس کا ذہن کہاں کہاں بھٹکتا رہتا۔ اس کی آنکھیں باہر کے مناظر دیکھنا چاہتیں۔ آخر اس محلے میں ہوتا کیا ہے۔ دن بھر تو کوئی خاص چہل پہل نہ ہوتی البتہ شام ہوتے ہی شور شرابے میں اضافہ ہو جاتا۔ عافیہ بند دروازے سے طرح طرح کی آوازیں سنتی رہتی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس اجنبی شہر میں آکر ایک پنجڑے میں قید ہو کر رہ جائے گی۔ وہ اس زندگی سے اوب سی گئی تھی آس پاس کے کسی پڑوسی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا مزید برآں کھڑکیاں بھی نہ کھولنے کی سخت تاکید تھی۔ اسے اس ماحول میں گھٹن سی ہونے لگی۔ یہ بھی کوئی جینا ہے۔ ہم سے بہتر تو پرندے ہیں جو آزادانہ طور پر پرواز کرتے رہتے ہیں۔ جہاں چاہا چلے گئے جس شاخ پر چاہا بیٹھ گئے۔ یہاں تو زندگی جیسے ایک محور پر گردش کر رہی ہے۔ صبح ہوتی ہے وسیم کے جانے کے بعد وہی اکیلا پن اس پر حملہ آور ہوتا رہتا ہے جب شام کو وسیم لوٹتا ہے تو زندگی میں جیسے تھوڑی سی رمق پیدا ہو جاتی ہے۔

شام کا وقت تھا۔ ٹی۔ وی دیکھتے ہوئے عافیہ کا دل اوب گیا تھا۔ باہر کے مناظر دیکھنے کے لئے دل بے تاب ہو رہا تھا' نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے کھڑکی کا پٹ آہستہ آہستہ کھول کر دیکھا۔ گہما گہمی اور شور وغل سڑک پر پھیلا تھا۔ عافیہ نے اپنے سامنے والے مکان کی طرف نظر کی جہاں چمکیلے لباس میں کئی طوائفیں کھڑی اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ بکھیرے چمکتی نگاہوں سے سڑک پر آتے جاتے راہ گیروں کو دیکھ رہی تھیں۔ کوئی راہگیر جب ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا اسے ہاتھ کے اشارے سے اوپر بلاتی' کوئی آنکھ مارتی' کوئی اس طرح انگڑائی لیتی کہ اس کا سینہ تیر کی طرح تن جاتا۔ خواہش مند لوگ چھت پر چڑھ جاتے۔ شریف لوگ ناگواری سے منھ بناتے ہوئے گزر جاتے۔ عافیہ کو عجیب سا لگا۔ طوائفوں کے بارے میں اس نے کہانیوں میں پڑھ رکھا تھا یا لوگوں سے سن رکھا تھا۔ وہ بہت دیر تک ان کی حرکتوں کو دیکھتی رہی۔ آتے جاتے راہگیروں کو تکتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے کھڑکی بند کر دی اور اپنے کمرہ میں لوٹ آئی——

''کتنی بیہودہ حرکتیں کرتی ہیں۔ مرد یونہی ان کی طرف مائل نہیں ہو جاتے۔''

جب رات کا دامن سیاہ ہو کر پھیل جاتا۔ ستارے اس سیاہ دامن پر موتیوں کی طرح جھلملانے لگتے تب عافیہ ان تنہائیوں میں گھنٹوں پڑی اپنی یادوں کے دیپ جلاتی رہتی۔ کتنی خوش تھی وہ اپنے شہر میں' نہ کوئی پابندی' نہ بندش۔ ہر طرح کی آزادی میسر تھی۔

شام کو اکثر وسیم کے ہمراہ کسی ریستوران میں چلی جاتی۔ پاس پڑوس میں سب جاننے والے تھے جب دل چاہتا کسی کے گھر چلی جاتی، کئی عورتیں عافیہ کے گھر بھی آجاتیں۔ وقت کیسے گزر جاتا پتہ بھی نہ چلتا۔

بھیگی ہوا کے لطیف جھونکے کھڑکی پر پڑے ہوئے پردوں سے ٹکرا رہے تھے۔ فضا میں غنودگی رچ گئی تھی اور خاموشی پھیلتی جا رہی تھی جب شام ہوتی باہر کے نظاروں کو دیکھنے کی خواہش عافیہ کے اندر سر ابھارتی۔ وہ چپکے سے کھڑکی کھولتی اور باہر کے مناظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتی رہتی۔ اس نے سوچا ــــــ ان طوائفوں کی بھی کیا زندگی ہے اپنی دلکش اداؤں سے گاہکوں کو رجھاتی ہیں اور چند روپیوں کے لئے اپنے جسم کا سودا کر بیٹھتی ہیں۔

حسب معمول عافیہ آج بھی کھڑکی کھول کر طوائفوں کی ادائیں دیکھنے میں محو تھی۔ اسے قطعی پتہ نہ تھا کہ سڑک کی دوسری جانب ایک نوجوان اس کے حسن کو نہار رہا ہے۔ جب اس نے سڑک کی دوسری طرف رخ کیا تو دیکھا وہ نوجوان اسے بغور دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی بند کر دی۔ اسے عجیب سا لگا۔ وہ نوجوان مجھے ہی کیوں گھور کر دیکھ رہا تھا کہیں اس نے مجھے بھی ....نہیں اب میں کھڑکی نہیں کھولوں گی۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے لیکن جب بوریت نے پھر اس پر حملہ کیا تو کھڑکی کا پٹ آہستہ سے نیم وا کیا اس وقت وہاں کوئی نہ تھا۔ اسے قدرے اطمینان ہوا اور بلا جھجک پوری کھڑکی کھول کر طوائفوں کی ادائیں دیکھنے لگی۔ وہ ان کی ادائیں دیکھ کر نہ صرف لطف اندوز ہو رہی تھی بلکہ چپکے چپکے اس کے اندر شاید کوئی خواہش بھی آہستہ آہستہ پانکھ نکال رہی تھی، انگڑائی لے رہی تھی کچھ دیر کے بعد جب اس نے سڑک کی دوسری جانب چہرہ گھمایا تو دیکھا وہ نوجوان اسی طرح کھڑا اسے نہار رہا ہے۔ اس بار اس نے ناگواری سے منھ بنایا اور دوسری طرف چہرہ گھما لیا۔ دیکھتا ہے تو دیکھنے دو میری بلا سے۔ راہ چلتے بھی تو بہت سے لوگ دیکھتے ہیں تو کیا گھر سے نکلنا بند کر دوں۔ میں کھڑکی بند نہیں کروں گی۔

آج کی شام بڑی خوشگوار تھی۔ عافیہ نے نہا دھو کر جب وارڈ روب کھولا تو اس کی نظر ایک چمکیلے لباس پر پڑی۔ اس نے سوچا آج یہ لباس پہن کر دیکھتی ہوں کیسی لگتی ہوں۔ وہ سامنے والی طوائف بھی تو کل اسی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے لباس زیب تن کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ خوب میک اپ کیا اور ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک لگائی ــــــ یاد آیا اسی رنگ کی لپ اسٹک اس طوائف نے لگائی تھی۔ بن سنور کر اس نے اپنے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا اور طوائفوں کے انداز سے چلتی ہوئی کھڑکی تک آئی اور کھڑکی کھول دی۔ وہ نوجوان حسب معمول وہاں کھڑا نہ جانے کب سے کھڑکی کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی جیسے اس کی مراد بر آئی ہو۔ اس نے ہاتھ ہلا کر وش کیا نہ جانے کس جذبے کے تحت عافیہ نے بھی مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔ وہ نوجوان تقریباً لپکتا ہوا دروازے کے پاس آ کر دروازے پر دستک دینے لگا۔ عافیہ سکتے میں آگئی یہ میں نے کیا کیا میں نے ہاتھ ہلا کر وش کیا اس نے مجھے غلط سمجھ لیا ہے اور اب دروازہ پیٹ رہا ہے۔ میں اسے جا کر سمجھا دیتی ہوں کہ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ اس نے نیچے آ کر دروازہ کھول دیا ــــــ

’’آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں کوئی طوائف.........‘‘

''میں نے بہت سی طوائفوں کو دیکھا ہے اس علاقے کا کوئی ایسا کوٹھا نہیں ہے جس پر میں نے رات نہ گزاری ہو لیکن تم بلا کی حسین ہو۔ تم کو کوئی بھی ایک دفعہ دیکھ کر گرویدہ ہو سکتا ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم اس پیشے میں نئی نئی آئی ہو اس لئے اتنے نخرے دکھا رہی تھی لیکن میں بھی ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔ آخر میں نے مجبور کر ہی دیا۔''

عافیہ کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نوجوان نے بڑھ کر عافیہ کو بانہوں میں بھر لیا۔ وہ کسمسائی لیکن احتجاج نہ کر سکی۔ ایک تو آج اس پر طوائفوں کی نقل اتارنے کی دھن سوار تھی اور دوسرے اگر شور شرابہ کرتی تو ہنگامہ کھڑا ہو جاتا وسیم الگ ناراض ہوتا کہ میرے سختی سے منع کرنے کے باوجود اس نے دروازہ کھولا ہی کیوں۔ وہ کچھ نہیں بولی لیکن جب اس کے حواس درست ہوئے تو دیکھا وہ نیم برہنہ بستر پر پڑی ہے۔ بستر پر سوسو کے پانچ نوٹ بکھرے پڑے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں نے یہ کیا کیا۔ آج مجھ پر طوائفوں جیسا رنگ کیوں چڑھ گیا تھا۔ میں نے نوجوان کو مسکرا کر اس کے وِش کا جواب کیوں دیا اور جب وہ دروازے کے قریب آ گیا تھا تو دروازہ کیوں کھولا۔ میں نے بہت بڑا جرم کیا ہے اگر وسیم کو پتہ چل جائے گا تو مجھے طلاق دے دے گا پھر وہ کہاں جائے گی؟.........کیا کرے گی؟......... یا خدا مجھ سے اتنا بڑا جرم سرزد کیوں ہو گیا.........''

عافیہ کی آنکھیں جو ہر لحظہ چمکتی رہتی تھیں اب ان میں اضطرابی کیفیت بھر گئی تھی۔ اس کی حالت اس وقت عجیب سی ہو رہی تھی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ وہ ہنسنا بھول گئی تھی۔ وہ اٹھی اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ نگاہوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک آواز دل کی گہرائیوں سے ابھری——عافیہ یہ تو نے کیا کیا؟ خود کو بربادی کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا—— لیکن چند لمحوں بعد ہی اس نے اپنی اس حالت پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ وسیم کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ نیچے اتری اور دروازہ بند کر دیا۔ باتھ روم میں گئی چہرے پر پانی ڈالا' ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر ہلکا سا میک اپ کیا تبھی وسیم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ آہستہ روی سے نیچے اتری اور دروازہ کھول دیا۔ وسیم نے دروازہ بند کر کے سیڑھی پر چڑھنے کے درمیان ہی اسے بانہوں میں بھر لیا۔ عافیہ پر کوئی ردّ عمل نہیں ہوا۔ اکثر جب وسیم خوش ہوتا اسے سیڑھی پر یا تو Kiss کرتا یا بانہوں میں بھر لیتا۔ عافیہ کہتی —— ''اوپر تو چلئے' اتنے اتاؤلے کیوں ہوئے جا رہے ہیں۔ میں کہیں بھاگی جا رہی ہوں'' ——وسیم اسے چھوڑ دیتا۔ دونوں ڈرائنگ روم میں آ جاتے۔ عافیہ اس کے لئے چائے بنا کر لاتی۔ وسیم دفتر کی باتیں کرتا رہتا اور عافیہ سنتی رہتی لیکن آج ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ اس نے چائے کا ٹرے لا کر رکھ دیا تھا۔ چہرہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ وسیم کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ اس نے رسالہ میز پر رکھتے ہوئے عافیہ کو دیکھا۔

''آج تمہارا چہرہ مرجھایا ہوا کیوں ہے؟''

''ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے'' ——اس نے بجھے لہجے میں کہا۔

''لیکن تم میں وہ دلکشی بھی نہیں جو روز محسوس کرتا تھا'' ——وسیم نے چھیڑا۔

''بس تھوڑا تکان کا اثر ہے۔''

''یا طوائفوں کے محلے میں رہتے ہوئے تمہارا بھی دل کسی پر آ گیا ہے''——عافیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

''کیا وسیم کو پتہ چل گیا کہ.........نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر وسیم کو معلوم پڑ گیا تو اس کی زندگی تلخ ہوجائے گی۔''

عافیہ کچھ نہیں بولی——''آپ ٹی۔وی۔ دیکھئے جب تک میں کھانا تیار کرتی ہوں''——اس نے اُٹھ کر ٹی۔وی۔ آن کر دیا اور ڈرائینگ روم سے نکل کر کچن میں آ گئی۔

بار بار وسیم کے ذہن کے اُفق پر عافیہ کا مرجھایا ہوا چہرہ ابھرتا۔ وہ سونے کے لئے بستر پر دراز ہوتا اور خاموش، سنسان کمرہ اوراس کی دیواروں کو تکتا ہوا تھک جاتا تو آنکھیں بند کر لیتا پھر بند آنکھوں میں نہ جانے کتنے سوال ابھرتے۔

عافیہ اس قدر خاموش کیوں رہتی ہے۔

اسکی ساری رعنائی کہاں روپوش ہوگئی ہے۔

اسے کون سا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔

اپنے بغل میں سوئی عافیہ کے چہرے کو دیکھتا جو بے خبر سوئی تھی۔ کمرہ میں اس کے ہونے کا احساس محض فرضی تھا۔ ویرانی چہار سمت پھیلی تھی۔

سورج دور مغربی پہاڑیوں میں لرزتا کانپتا غروب ہو رہا تھا۔ آج دفتر میں تعطیل ہونے کی وجہ سے وسیم گھر پر ہی تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وسیم نے اٹھ کر لائٹ آن کر دیا۔ روشنی نے اندھیرے کو نگل لیا لیکن عافیہ کے اندر جو اندھیرا در آیا تھا وہ کسی بلب کی روشنی سے دور ہونے والا نہیں تھا۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھی وہ نہ جانے کس سوچ میں غرق تھی۔ وسیم ٹی۔وی۔ دیکھنے میں محو تھا اور چائے کی چسکی بھی لے رہا تھا کہ عین اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز سن کر وسیم کا ذہن دروازے کی طرف گیا—— کون ہوسکتا ہے؟ دفتر کے کسی آدمی کو گھر کا پتہ تو بتایا نہیں ہے پھر کون آ سکتا ہے۔ وسیم اٹھا اور نیچے آ کر دروازہ کھول دیا۔ دو آدمی بلا جھجک اندر داخل ہوگئے۔

''اے بھائی کہاں جا رہے ہیں؟ آپ لوگ کون ہیں؟''

''ارے یار روکتا کیوں ہے اگر پہلے روپئے چاہئے تو یہ لے آج میں اپنے دوست کو لے کر آیا ہوں۔''

وہی نوجوان بولا اور جیب سے سو سو کے کئی نوٹ نکال کر وسیم کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور دندناتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وسیم نے ایک نگاہ روپیوں پر ڈالی اور ایک نگاہ اوپر چڑھتے ہوئے دونوں نوجوانوں پر جواب اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئے تھے۔

(موپاساں کی کہانی ''دی ونڈو'' سے متاثر ہوکر)

●●

سمندر جاگ رہا ہے

بھیانک رات.........!

گھٹا ٹوپ اندھیرا اور اندھیرے میں ڈوبا ایک جزیرہ' جزیرے کے وسط میں ایک شہر لیس بوس (LES BOSE)' ویران سڑکیں اور خاموشی کا سینہ چیرتی تیز رفتار گاڑیوں کی آوازیں۔ جیسے جیسے رات بھیگتی گئی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ آوازیں معدوم ہوگئیں لیکن شانت سمندر کی لہروں میں ایک دل آویز موسیقی گھلی ہوئی تھی جو آس پاس کے علاقے کو مترنم کررہی تھی۔ سارا علاقہ پرسکون نیند کی آغوش میں پینگیں لے رہا تھا مگر سمندر جاگ رہا تھا۔ اسکی لہریں ساحل تک آتیں اور اسے بوسہ دے کر پھر سمندر میں لوٹ جاتیں۔ اس حسین اور دلکش منظر کو دیکھنے والا وہاں کوئی موجود نہ تھا البتہ ساحل سے ملحق ایک گھر کے دروازے پر دھپ کی ایک آواز نے مکین کو نیند میں چونکنے پر مجبور ضرور کردیا تھا——

''کون ہے؟''——وہ بستر سے اُٹھنا نہیں چاہتی تھی مگر گہری خاموشی کے بعد پھر دھپ کی آواز اُبھری۔

''کون ہے؟'' اس بار اسکے لہجے میں ناراضگی تھی۔

''دھپ.........دھپ.........دھپ.........''

''ارے کون ہے کوئی نام پتہ ہے یا نہیں؟''—— وہ غصے میں اُٹھ کر بیٹھ گئی مگر دروازہ کھولنے کی ہمت یکجا نہیں کر پا رہی تھی کہ دستک دینے والے نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا تھا۔

دھپ دھپ کی آواز جاری رہتی ہے۔

''ارے گونگے ہو کیا' کچھ بولتے کیوں نہیں؟''——اب اُس کے اندر اضطراب اور غصے کی ملی جلی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

''دھپ!''

وہ سہم گئی۔

خاموشی.........گہری خاموشی.........

کچھ لمحہ خاموشی کے بعد پھر وہی دھپ دھپ کی آوازیں پھر گہری خاموشی۔

وہ اُٹھی اور دبے پاؤں دروازے تک پہنچی مگر دروازہ کھولنے کی ہمّت یکجا نہ کر پائی۔ وہ اس گھر میں اکیلی تھی۔ اُسے حیرانی تھی کہ آخر کوئی بولتا کیوں نہیں۔ دستک دینے والا کون ہے۔ جب یہاں کوئی موجود نہیں ہے کیا کوئی آسیب ہے یا کوئی مجھے خوف زدہ کرر ہا ہے۔ کچھ دیر کھڑی رہنے کے بعد پھر پلنگ تک آئی اور بستر پر بیٹھ گئی۔

''دھپ''

اس بار وہ غصے سے اُٹھی ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے میں ڈنڈا لے کر دروازے کے پاس آئی اور یک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ اس نے دیکھا دروازے کے پاس ایک کتّا اور ایک کتیا اختلاط میں مشغول ہیں اختلاط کے درمیان دروازے سے ٹکرانے سے دھپ دھپ کی آواز ہو رہی تھی۔ اس نے ڈنڈا زمین پر پٹخا، دونوں کیں...کیں کرنے لگے۔ وہ زیر لب مسکرائی اور دل ہی دل میں بدبدائی——— ''انہیں اور کوئی جگہ نہیں ملی تھی''——— دروازہ بند کر کے بستر پر آ کر دراز ہو گئی۔ اب اس کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی تھی۔ بار بار اس کا ذہن کتّے کے اختلاط کی طرف مرکوز ہو جاتا۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی ہوئی اور وہ سوچ کی دنیا میں دور بہت دور نکل گئی کہ پھر کسی کی دستک نے اسے اُن حسین وادیوں سے لوٹا کر کمرہ میں ہونے کے احساس دلا دیا۔

دستک!

''کون ہے؟''———

ما.......ما.........میں........ایک مردانہ آواز اُبھری جسے سن کر وہ چونک گئی۔ یہ کس کی آواز ہو سکتی ہے۔ اب کون سا جانور آ گیا۔ اس نے اس طرح کی آواز پہلی بار سنی تھی۔ استعجاب نے سر اُبھارا اس نے گھبرا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک خوبرو نوجوان اسکے سامنے کھڑا تھا۔ اسکے لباس پانی سے بھیگے ہوئے تھے بلکہ پورا وجود تر بہ تر تھا۔ بدن تھکا تھکا اور آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ کسی مرد کو اس نے اس جزیرے میں پہلی بار دیکھا تھا۔

''تو.........تو........تم کون ہو.........کوئی جانور تو نہیں........ایسا ذی روح میں نے پہلی بار دیکھا ہے''———

''میں بھی انسان ہوں بالکل تمہاری طرح۔ فرق یہ ہے کہ تم عورت ہو اور میں مرد———''

''مرد........'' اس لڑکی نے اسے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا۔ لفظ 'مرد' اس نے پہلی بار سنا تھا۔

''ہمارے جزیرے میں مرد نام کا کوئی ذی روح نہیں رہتا۔ صرف عورتیں رہتی ہیں۔ تم کہاں سے آ گئے۔ اندر آ جاؤ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو تمہاری گردن ماردی جائے گی۔''

اس نوجوان نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور فوراً اندر آ گیا۔ لڑکی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ نوجوان استعجاب میں ڈوب گیا کہ یہ کیسا جزیرہ ہے جہاں مرد کا تصور نہیں۔

''ہاں اب بتاؤ تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے آئے؟''

''میں جہازی ہوں۔ایک ملک سے دوسرے ملک میں جہاز سے تجارت کی غرض سے سفر کرتا رہتا ہوں۔سمندر میں طوفان آنے کی وجہہ سے میرا جہاز ڈوب گیا۔ میں کسی طرح تیرتا ہوا اس جزیرے میں آ گیا اور اب تمہارے سامنے کھڑا ہوں''——اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ بتا دیا۔

وہ بہت دیر تک سوچتی رہی پھر ایک کتاب نکال کر جلدی جلدی پنے کو پلٹنے لگی۔کافی پنّے پلٹنے کے بعد ایک بوسیدہ سی تصویر نظر آئی۔جس میں اس نوجوان کی طرح ایک مرد نظر آیا۔جسے ایک جلاّد عورت پھانسی کی سزا دے رہی تھی۔اُس نے مرد کے بارے میں اپنے اباواجداد سے سن رکھی تھی۔

''اوہ! تو تم مرد ہو۔جو زمانۂ قدیم میں کبھی اس جزیرے میں بھی ہوا کرتے تھے۔لیکن یہاں کی حکمراں سیفو اوّل نے سب کو تہہ تیغ کر دیا تھا۔اور صرف عورتوں کی حکومت قائم کر دی تھی۔اب یہاں صرف عورتیں ہی رہتی ہیں۔''

اُس نوجوان کو حیرانی ہوئی۔

''کیا دنیا میں ایسا بھی کوئی جزیرہ ہے جہاں صرف عورتیں ہی رہتی ہیں اور سارا نظام عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔''

''ہاں، اور یہاں مردوں کا آنا سخت منع ہے اگر غلطی سے کوئی آ جاتا ہے تو اسے سزائے موت دی جاتی ہے۔جیسا کہ اس تصویر میں پھانسی کی سزا دی جا رہی ہے.........دیکھو.........اس نے کتاب آگے کر دی۔''

''کیا کہا.......تو کیا میری موت یہاں مجھے کھینچ لائی ہے؟''

''اگر کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو تمہاری موت یقینی ہے۔اس لئے جتنی جلد ہو سکے اس جزیرے سے نکل جاؤ۔''

''میں تو اس جزیرے میں بالکل اجنبی ہوں۔رات میں کسی طرح چاند کی روشنی میں آپ کے گھر تک پہنچ گیا کیونکہ سمندر سے آپ کا گھر بالکل نزدیک تھا لیکن اب صبح ہونے والی ہے اب تو میری جان آپ کے رحم و کرم پر ہے۔''

''ایسا ہے کہ میں فی الحال تمہیں اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیتی ہوں لیکن گھر سے باہر قدم ہرگز نہیں رکھنا۔نہیں تو مارے جاؤ گے۔موقع دیکھتے ہی میں تمہیں کسی طرح اس جزیرے سے نکال دوں گی۔''

''بہت بہت شکریہ۔میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارے کھانے پینے کا انتظام کرتی ہوں۔تم اس کمرے سے باہر مت آنا''——یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔وہ نوجوان پلنگ پر بیٹھ گیا اور اس طلسمی جزیرے کے بارے میں سوچنے لگا۔

اسے گھر میں مقید ہوئے کئی دن گذر گئے لیکن جزیرے سے باہر جانے کی کوئی سبیل ابھی تک نہیں نکلی تھی۔وہ باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر اس جزیرے میں عورتیں سارا نظام کیسے چلاتی ہیں۔جب وہ عورت کام پر چلی گئی تو اس نے زنانہ بھیس بدلا اور گھر سے باہر آ گیا۔سڑکوں پر صرف عورتیں ہی عورتیں نظر آ رہی تھیں۔ایک بھی مرد کا نام و نشان نہیں تھا۔ٹریفک پولس سے لے کر تھانہ، صفائی، ہسپتال، پولس، تعلیم سب کام عورتوں کے ہاتھوں میں تھا اور سب اپنا کام بخوبی نبھا رہی تھیں۔ایک عورت ہنس کر

دوسری عورت سے ملتی تو ایک دوسرے کو بوسہ دیتیں ۔وہ حیرانی میں ڈوبا تھا کہ سائرن کی آواز ابھری، وہ چونک گیا۔ پولس کی گاڑی سڑک پر راستہ بنارہی تھی۔راہ چلتی عورتیں سڑک کے کنارے کھڑی ہوگئیں ۔وہ بھی سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔

''یہ کیا ہورہا ہے؟''——اُس نے آواز بدل کر پاس کھڑی ایک عورت سے پوچھا۔

''جزیرے کی وزیراعظم گزرنے والی ہیں۔''

''اوہ! کیا نام ہے ان کا؟''——اُس عورت نے آنکھیں تریر کر دیکھا کہ یہ کیسی عورت ہے جو وزیراعظم کا نام بھی نہیں جانتی۔

''سیفوتھری (Safothree) نام ہے ان کا۔''

وزیراعظم کا قافلہ گزرگیا۔سڑک کی رفتار پھر معمول پر آگئی۔

جب وہ لوٹ کر گھر پہنچا تو جزیرے کا منظر دیکھ کر حیران تھا۔اس نے خوبصورت سے خوبصورت لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ایک بھی لڑکی بدصورت اُسے نظر نہیں آئی۔اتنے حسین چہرے اس نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ایسا لگتا تھا پوری دنیا سے خوبصورت لڑکیوں کو لاکر یہاں یکجا کر دیا گیا تھا۔

وقت گذرتا جارہا تھا اور مرد کے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ہموار نہیں ہوا تھا۔وہ عورت بھی روز کوئی نہ کوئی ترکیب ضرور سوچتی لیکن اسے عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہتی کہ ہر ترکیب میں مرد کی شناخت حائل ہوجاتی۔اس کے پکڑے جانے کا خدشہ دامن گیر رہتا جب مرد نے اُسے پریشان دیکھا تو گویا ہوا۔

''میں جانتا ہوں تم میری وجہ سے کافی پریشان ہو۔اگر موت کا ڈر نہیں ہوتا تو میں کب کا یہاں سے نکل جاتا لیکن موت کا ڈر ہر لمحہ مجھے بھی پریشان کررہا ہے۔''

''یہی بات تو مجھے بھی پریشانی میں مبتلا کررکھا ہے۔بہرکیف کوئی نہ کوئی راستہ تو ضرور نکل آئے گا۔لو چائے پیو''——اس نے چائے کا گلاس مرد کی طرف بڑھایا۔گلاس لیتے وقت مرد کا ہاتھ اس عورت سے مس کرگیا۔عورت کو ایک عجیب طرح کے لمس کا احساس ہوا۔وہ سوچنے لگی کہ اس کا ہاتھ مَس کرنے سے یہ عجیب طرح کے لمس کا احساس کیوں ہوا؟ لیکن اس سوچ کو اس نے فوراً جھٹک دیا۔گاہے گاہے اکثر اس عورت کا کوئی نہ کوئی عضو اس مرد کو چھوجاتا اور اس کے اندر ایک عجیب لمس کا احساس ہوتا۔

رات کا تیسرے پہر گزررہا تھا مگر اس عورت کی آنکھوں سے نیند غائب ہوگئی تھی۔بار بار اس لمس کو محسوس کرکے دل ہی دل میں محظوظ ہوتی رہتی۔اسی لمحہ ایک عجیب سرشاری اس کے اندر پیدا ہوگئی اور وہ اپنے کمرہ سے نکل کر مرد کے کمرہ میں گئی۔مرد گہری نیند سورہا تھا۔وہ بستر پر بیٹھ گئی اور دھیرے دھیرے ہاتھ بڑھا کر اس کے بدن کو سہلانے لگی ،مرد جاگ گیا اور ایک خوبصورت عورت کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر وہ بھی اپنا ہوش کھو بیٹھا۔اُس نے عورت کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور وہ عورت اس کی بانہوں میں سماتی چلی گئی۔

عورت زندگی میں پہلی بار اس عمل سے گزری تھی اور اس لذت سے آشنا ہوئی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مرد میں ایسا کیا ہے جو یہاں کی عورتوں کے ساتھ مباشرت کرنے میں نہیں۔ اس طرح کی لذت کیا صرف مرد سے ہی ممکن ہے؟ جس کے چھونے سے پورے وجود میں ایک نئے لمس کا احساس جاگ جاتا ہے اور بار بار اس کے قریب جانے کا دل کرتا ہے۔ اب وہ ہر رات اس کے کمرہ میں چلی جاتی اور اس کی بغل میں سو جاتی۔

وقت لمحہ لمحہ گزرتا رہا۔ وہ اس مرد کو جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہمیشہ کے لئے اس کے پاس ہی رہ جائے کیونکہ جو لذت وہ دے رہا تھا اس سے قبل وہ اس سے نا آشنا تھی۔ اب تک وہ اپنی جنسی خواہش صرف عورتوں سے ہی پوری کرتی تھی جس میں وہ لذّت نہیں تھی جو یہ مرد دے رہا تھا لیکن وہ مرد گھر میں قید رہ کر زیادہ دن رہنا نہیں چاہتا تھا۔ جب کبھی اس کا دل چاہتا زنانہ لباس پہن کر شہر میں نکل جاتا۔ گھومتا پھرتا، ہوٹل میں کھاتا پیتا اور گھر واپس آجاتا لیکن اس زندگی سے وہ اُکتا گیا تھا۔ اُسے اپنی بیوی، بچے، روزگار یاد آنے لگے تھے۔ وہ لوٹ جانا چاہتا تھا مگر عورت کسی طور اُسے چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ جزیرے سے نکلنا مشکل تھا۔ جب تک کسی کشتی یا جہاز کا انتظام نہ کیا جائے۔ لیکن اس جزیرے میں نہ کوئی جہاز آتا نہ جاتا، البتہ کشتی سے عورتیں سمندر کی سیر کرتیں، پھر واپس آجاتیں۔

جب کئی مہینے گزر گئے تو عورت نے اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کی۔ اس کے پیٹ میں اُس مرد کا بچہ پل رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گئی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا' معائنے کے بعد ڈاکٹر کے چہرے پر تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ شلف سے ایک کتاب نکال کر اس کا مطالعہ کیا۔

''اس کا مطلب تم ماں بننے والی ہو''———

''یہ ماں بننا کیا ہوتا ہے؟''———اس عورت نے یہ لفظ بھی پہلی بار سنا تھا۔

''جب کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ مباشرت کرتی ہے تو اس کے پیٹ میں حمل ٹھہر جاتا ہے اور نو مہینے کے بعد وہ بچے کو جنم دیتی ہے لیکن اس جزیرے میں عورتیں اس عمل سے نہیں گزرتیں کیوں کہ یہاں صرف عورتیں ہی عورتیں رہتی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس جزیرے میں کوئی مرد ہے۔''

''ہاں! میرے گھر میں ایک مرد ہے۔ وہ جہازی ہے اور جہاز ڈوب جانے کی وجہ سے کسی طرح اس جزیرے میں پہنچ گیا ہے۔''

''تم جانتی ہو اگر حکومت کو پتہ چل گیا تو تمہارے ساتھ اسے بھی پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا۔ اس لئے اس حمل کو ضائع کر دو اور اس مرد کو جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکال دو۔''

''میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی کیونکہ جو لذت وہ دے رہا ہے۔ یہاں کی عورتیں نہیں دے سکتیں۔ میں اس کے ساتھ اس کی دنیا میں جانا چاہتی ہوں۔ جہاں مردوں کے ساتھ جینے کی آزادی ہے۔''

''تم کوئی بھی فیصلہ لینے کے لئے آزاد ہو۔آ گے تمہاری مرضی ۔میں نے تمہیں آ گاہ کر دیا۔''

وہ عورت وہاں سے نکل کر گھر کی طرف چل پڑی ۔اس نے پورے راستے ایک پلان بنایا کہ کس طرح اسے اُس مرد کے ساتھ اس جزیرے سے نکلنا ہے۔اس نے بہت سارا کھانے پینے کا سامان بازار سے خرید لیا اور سامان سے لدی پھدی گھر پہنچی مگر یہ کیا اس نے دیکھا پولس مرد کو پکڑ کر لے جا رہی ہے۔اس نے خود کو چھپا لیا۔جب پولس چلی گئی تو وہ گھر میں داخل ہوئی۔

پولس نے اس مرد کو وزیراعظم کے سامنے پیش کیا۔وزیراعظم نے اس مرد کا بغور جائزہ لیا اور کہا——

''اس مرد کو میرے حرم میں پیش کیا جائے اور میری تلوار لائی جائے۔

میں اسے خود سے سزا دینا چاہتی ہوں۔''

مرد کو وزیراعظم کے خواب گاہ میں بھیج دیا گیا۔وزیراعظم صاحبہ تلوار کے ساتھ خواب گاہ میں تشریف لے گئیں۔محل میں چہ منگوئیاں ہونے لگیں کہ اب اس مرد کا خاتمہ یقینی ہے لیکن کافی وقت گزر جانے کے بعد نہ دروازہ کھلا اور نہ مرد کے چیخنے کی کوئی آواز آئی۔محل کے سپاہی اور عہدے داران حیران تھے۔وقت گزرتا گیا اور حیرانی بڑھتی گئی۔تین دن کے بعد جب درواز کھلا تو وزیراعظم کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔وہ ہنستی ہوئی باہر آئی۔اس نے مرد کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔اس نے ڈرائیور کو کار نکالنے کا حکم دیا اور اس مرد کے ساتھ شہر کی سیر کو نکل پڑی۔

●●

آتش فشاں

آج پھر زویا نے اپنی آنکھوں میں ایک چبھن محسوس کی۔ حالانکہ یہ چبھن وہ کئی سالوں سے محسوس کر رہی تھی لیکن ادھر کئی دنوں سے اس چبھن نے شدّت اختیار کر لی تھی۔ اُس وقت اس کی آنکھوں میں جانے پہچانے مانوس سے چہروں کے نقوش ابھر آتے تھے جو اپنے کردار سے کریہہ اور اس قدر بدنما تھے کہ کوئی بھی ان سے حد درجہ نفرت کر سکتا تھا۔ یہ چہرے تھے زویا کی سوتیلی ماں ثریا، بھائی راحیل اور بہن ڈولی کی۔ اُن چہروں کے نقوش ابھرتے ہی اس کی آنکھوں سے نفرت کا ایک آتش فشاں پھوٹ پڑتا۔ زویا نفرت کے اس آتش فشاں کو ہر لمحہ، ہر پل زندہ رکھنا چاہتی تھی کہ نفرت کی آگ کبھی ختم نہ ہو لیکن انہیں نفرت زدہ چہروں کے درمیان اس کے والد جمال فاروقی کا ایک چہرہ بھی ابھرتا جو نہ صرف قابل رحم تھے بلکہ ان کی زندگی کا زویا جتنا بھی ماتم کرتی کم تھا۔ حالانکہ کسی حد تک وہ خود کو بھی اس کا قصوروار تسلیم کرتی۔

بات اس وقت کی ہے جب وہ بارہ برس کی تھی۔ اچانک ہارٹ اٹیک کی وجہہ سے اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس سانحے نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا لیکن سب سے بڑا سانحہ تو اس وقت ہوا جب زویا نے اپنے والد کو دوسری شادی کے لئے امادہ کر لیا۔ ایک بانکی ترچھی عورت ثریا اس کے والد جمال فاروقی کی زندگی میں ایک حشر بداماں کی طرح شامل ہوئی جس نے آتے ہی ان کی زندگی کو متزلزل کر دیا۔ نتیجتاً زویا کو بورڈنگ اسکول میں ڈال دیا گیا۔

ثریا میں ایک آگ تھی جو لمحہ لمحہ جمال فاروقی کے وجود کو جلا رہی تھی۔ ثریا سے دو بچے راحل اور ڈولی تھے لیکن شاید ثریا کے لئے لفظ محبت کے کوئی معنی نہ تھا۔ زمانے سے یا مردوں سے ایک سفا کی بر ہی تھی۔ اس کا ماننا تھا کہ زندگی کا کون سا لمحہ کن معنوں میں فیصلہ کن ثابت ہوگا اور انسان کی آرزوئیں، خواب، توقعات اور حوصلے سب ایک ان دیکھے اور انجانے آتش فشاں کے لاوے میں بہہ کر برباد ہو جائیں گے۔

جمال فاروقی اس بات سے بالکل بے خبر رہتے کہ ثریا کب اور کیوں برافروختہ ہو جائے گی وہ کسی بھی بات پر بلا وجہہ لال پیلی ہو جایا کرتی تھی۔ وہ ان کے مزاج اور ان کے نزدیک ناپسند رویوں کو کبھی بھی ضبط و تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتی تھی۔ وہ کہتی ——

''میں جانتی ہوں تم مجھ میں اُس حد تک دلچسپی نہیں رکھتے لیکن مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں کیوں کہ میں جیسی ہوں ویسی ہی رہوں گی۔ میں خود کو بدل نہیں سکتی۔ میں آسمان کو جھکانا چاہتی ہوں۔ ہر چیز کو خود کی تابع بنانا چاہتی ہوں۔ ایسا نہیں ہونے پر میرے اندر جھنجھلاہٹ کی ایک تیز لہر دوڑ جاتی ہے۔ میرے اندر سے ایک آتش فشاں پھوٹتی ہے پھر میں یہ بھول جاتی ہوں کہ سامنے والے کا کیا انجام ہوگا۔ لیکن تم قابل رحم بھی ہو کہ اتنی تضحیک کے بعد بھی میرے ساتھ رات میں میرے بستر پر سوتے ہو، میرے کپڑے اتارتے ہو اور مجھے مطمئن کر دیتے ہو بس اسی لمحہ میں کمزور پڑ جاتی ہوں کہ اس وقت تم شیر بن جاتے ہو اور میں بھیگی بلّی۔''

جمال فاروقی خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہتے اور دل ہی دل میں سوچتے ــــــ

''کاش میں شادی نہ کرتا۔ میں زویا کی بات قطعی نہ مانتا لیکن میں نے دانستہ طور پر اپنی زندگی کا دروازہ ثریا کے لئے کھول دیا تھا اور وہ دندنا کر اس میں داخل ہوگئی تھی۔ میرا چین سکون سب نیست نابود کرنے کے لئے اور میں محض تماشائی اپنی بربادی کو نوحہ پڑھ رہا ہوں۔''

جمال فاروقی کبھی اپنے ہونٹوں پر حرف شکایت نہ لاتے لیکن زندگی کے تجربات نے یہ ضرور سکھا دیا تھا کہ فتح سے زیادہ شکست کی تعظیم کرنی چاہیۓ۔ وہ بستر سے اٹھے، کھڑکی کا پٹ کھولا۔ باہر سڑک پر انسانوں، گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ زندگی اپنے معمول پر تھی لیکن ان کی زندگی میں ایک آتش فشاں اس دن سے دہک رہا تھا جس دن سے ثریا ان کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ ثریا بستر پر چین سے سو رہی تھی مگر جمال فاروقی نہ جانے کب سے جاگ رہے تھے۔ انہیں خود پتہ نہ تھا۔ کھڑکی کا پٹ بند کیا اور پھر سے بستر پر دراز ہو گئے اور اس کی طرف پیٹھ کر کے سو گئے۔ وہ نفرت اور ترشی کے لہجے سے ثریا کو گوش گزار کرنا چاہتے تھے مگر جب وہ سامنے آتی نہ جانے کیوں کمزور پڑ جاتے۔ ساری مدافعت جواب دے جاتی۔ وہ اسے بتانا چاہتے کہ زندگی محض آرام و آرائش، سیر و تفریح کا نام نہیں بلکہ زندگی اس کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ زندگی میں کوئی ضروری نہیں کہ صرف نفرت کی ایک دنیا آباد کی جائے بلکہ محبت سے بھی کسی کو زیر کیا جا سکتا ہے لیکن جمال فاروقی کی ساری قوتیں جواب دے جاتیں۔

کیسا تباہ کن اندھیرا ان کی زندگی میں داخل ہو گیا تھا جو غارت گر بھی تھا اور خلاق بھی اور کیسا ہولناک سناٹا تھا جو ان کے وجود کو غضبناک درندہ بن کر روز چیرتا پھاڑتا اور تکہ بوٹی کرتا رہتا ہے اور وہ ہچکیوں، سسکیوں میں اپنی ذات کو یکسر ڈبوئے رہتے۔ آخر وہ اتنا ڈرپوک مرد کیسے بن گئے اور ثریا اس کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر حرام زادہ، بدعقل کہہ کر فراٹے سے ننگی ننگی گالیاں دیتی رہتی ــــــ

''بدذات مرد، میں جو سلوک تمہارے ساتھ کر رہی ہوں یہی تمہاری قسمت ہے۔ تم اسے بدی سمجھتے ہوگے لیکن مجھے اپنی اس حرکت پر ذرا بھی ملال نہیں۔ میں تمہیں اذیت پہنچا کر بے حد خوش ہوتی ہوں اور اس طرح تم مزید کمزور ہوتے جاتے ہو اور میں بے باک اور بے پرواہ کہ یہی میرے جینے کا سلیقہ ہے.........چلو بچو فلائٹ کا وقت ہو گیا ہے نینی تال جانا ہے۔''ــــــ

ثریا اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی اور اس کے پیچھے بچے بھی ساتھ ہو لئے۔ جمال فاروقی حیرت زدہ نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے کہ اب اس کا یہاں کوئی نہ تھا۔ ایک بیٹی تھی جو اپنی سسرال میں تھی اس پر اب اس کا کوئی حق بھی نہ رہا تھا۔ اب اس کا اپنا کچھ بھی نہ بچا تھا۔ ساری دولت پر ثریا نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے وجود کو آئینہ میں دیکھا۔ اس کا اپنا چہرہ بھی اجنبی سا لگنے گا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ٹٹولا۔ چہرہ تو وہی تھا نقوش کیوں بدل گئے تھے۔ اس کے حلق سے ایک ہلکی سی آواز نکلی۔ ایسا لگا کہ یہ آواز بھی اس کی نہیں ہے۔ ثریا کا لمس جسے اس نے صرف رات میں بستر پر ہی محسوس کیا تھا اب اس میں بھی کوئی کشش باقی نہ رہی تھی بلکہ اجنبیت کا احساس زیادہ ہو رہا تھا۔ ثریا اس کے اندر حیرتوں کا وہ جادو جگا رہی تھی جسکے اثر سے باہر نکلنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ ہر روز ایک نیا طوفان برپا کرتی۔ اب اس کا دل گھر میں ایک پل نہ لگتا۔ کبھی ہوٹل، کبھی کلب، کبھی سہیلیوں کے یہاں، کبھی کسی ہل اسٹیشن پر......... جس تنہائی کو بانٹنے کے لئے جمال فاروقی نے دوسری شادی کی تھی وہ مقصد ہی فوت کر گیا تھا۔ اس نے ایک ایسا جال ان کے گرد بن دیا تھا کہ خود کو اس سے کبھی نکال نہ سکے یا پھر نکل جانے کا ان کے اندر حوصلہ ہی باقی نہ رہ گیا تھا۔ ان کا رواں رواں جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ایسی پراسرار عورت سے کب چھٹکارا ملے گا۔ لیکن سب لاحاصل ـــــــ مشتعل لمحوں نے پوری زندگی کو احاطہ کر لیا تھا۔ وقت نے اس کے جسم اور روح کو اندر تک زخم آلودہ کر دیا تھا۔ ثریا وہاں نہ ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود ہوتی اپنی ناپسندیدگی کی رمق لئے، وہ بولتی ـــــــ

''جمال فاروقی مجھے تم پر ترس اس لئے آتا ہے کہ تم نے نہ جانے کن بدبخت لمحوں میں میرا ہاتھ مانگا تھا۔ میں تمہیں ایک ان دیکھا سکھ دینا چاہتی تھی لیکن میں ڈر گئی تھی کہ اگر تم مجھ پر حاوی ہو گئے تو میں ایک عام عورت کی طرح زندگی گزاروں گی اور مر جاؤں گی جبکہ میں اپنے طور پر زندگی جینا چاہتی تھی......... بالکل آزاد......... جس پر کوئی پابندی نہ ہو......... کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہو......... اس لئے بے ترتیبی، بے ضابطگی اور نراجی کیفیت اپنے اندر پیدا کی اور اس پر اپنی زندگی ڈال دی اور آج بھی اس پر رواں دواں ہوں۔''

جمال فاروقی اس کی باتیں سن کر ششدر نہیں ہوئے یہ روز کا معمول تھا کہ ثریا ہر روز نئے نئے انکشافات کرتی رہتی۔ کبھی اپنے وجود سے اور کبھی اپنی باتوں سے......... ہاں جمال فاروقی کو زندگی میں ایک انمول تجربہ ضرور ہوا کہ ایک عورت جو بادصبا کا مہکتا ہوا جانفزا جھونکا بھی ہے جو کسی کی زندگی کو اس قدر معطر کر دیتی ہے کہ وہ اس کی خوشبو میں زندگی بھر ڈوبا رہتا ہے اور وہی عورت شجر، حجر، دریا، پہاڑ، پل اور محلات کو مسمار کر دینے والا آتش فشانی کا لاوا بھی ہے جو کسی کی زندگی کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے کسی کے وجود کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ کسی کی روح کو اس حد تک اذیت پہنچاتی ہے کہ وہ جب تک زندہ رہتا ہے کراہتا رہتا ہے اور یقیناً جمال فاروقی کو نہ جانے کون سا روگ لگا تھا کہ اب اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ جسم کی ہڈیاں کمزور ہونے لگی تھیں اور آنکھوں کی بینائی بھی جواب دینے لگی تھیں۔ اس نے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو دکھایا لیکن بیماری بڑھتی گئی۔ جب زویا کو پتہ چلا کہ ابّا سخت بیمار ہیں تو ان کے پاس آئی۔ شہر کے مشہور ڈاکٹروں سے دکھایا لیکن کچھ حاصل نہ تھا۔ جمال فاروقی کی دیکھ بھال کے لئے

ان کا وفادار نوکر شفیق تھا جو ہر پل ان کے ساتھ رہتا۔ دوا دیتا، پانی پلاتا، کھانا کھلاتا گویا وہ واحد سہارا تھا جس کی وجہ سے ان کے سانسیں چل رہی تھیں۔

دن گزرتے گئے رفتہ رفتہ ان کی بیماری بڑھتی گئی اور وہ بستر مرگ پر پڑے اُس دن کا انتظار کرنے لگے کہ کب روح ان کے اس مردہ جسم سے پرواز کا جائے لیکن موت نے بھی جیسے ثریا کی طرح بے اعتنائی برت لی تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

اس روز سارا دن جمال فاروقی ایک عجیب سی کیفیت میں مضطرب رہے رات سے ہی بے چینی بڑھ گئی تھی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے لیکن بار بار بند ہو جاتیں۔ دوپہر کو ثریا اپنے بچوں کے ساتھ اپنے کمرہ سے نکلی۔

''سنئے میں ہانگ کانگ جا رہی ہوں۔ ایک ہفتہ کے بعد لوٹوں گی۔ شفیق تمہاری دیکھ بھال کرے گا۔''

ثریا' جمال فاروقی سے بول رہی تھیں لیکن شاید وہ کچھ سن نہیں پا رہا تھے یا سن کر بھی ان سنی کر رہے تھے۔ شفیق نے ثریا کی طرف دیکھا۔

'مالکن' مالک کی حالت رات سے بگڑتی جا رہی ہے۔ ایسے حالات میں آپ کو نہیں جانا چاہئے۔''

''شرٹ اپ، خبردار جو میرے کسی فیصلے میں ٹانگ اڑایا۔ میرا فیصلہ اٹل ہے میں نے پروگرام طے کر لیا تو کر لیا چاہے کوئی مر ہی کیوں نہ جائے۔''

''مالکن ایسی باتیں نہ کیجئے۔ خدا مالک کی عمر لمبی کرے۔''

''لمبی کرے یا چھوٹی مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں.........چلو راحیل اور ڈولی.......''

ثریا اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

کوئی انسان بدقسمتی سے اپنی پسند کی زندگی جی نہیں پاتا لیکن اپنی پسند کی موت مرنے کا موقع ضرور ملنا چاہئے لیکن جمال فاروقی نہ اپنی پسند کی زندگی جی سکے اور نہ موت نے اس کا موقع دیا۔

شفیق بار بار جمال فاروقی کی طرف دیکھتا۔ رہ رہ کر ان کی سانسیں رک رہی تھیں دفعتاً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف زویا تھی۔

''زویا بی بی مالک کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ ان کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے مالکن اپنے بچوں کے ساتھ ہانگ کانگ چلی گئی ہیں۔ آپ فوراً آ جایئے۔ کسی بھی وقت سانسیں بند ہو سکتی ہیں۔''

زویا شفیق کی باتیں سن کر گھبرا گئی۔ ایک ان دیکھے اور انجانے خوف سے وہ لرز گئی جیسے اب اس کے والد کی زندگی میں زلزلہ آنے والا ہے اور سب کچھ بہت جلد زمیں بوس ہونے والا ہے اور اس زلزلہ میں ان کی آرزوئیں، تمنائیں، حوصلے سب دفن ہونے والے ہیں۔ کیا بروقت وہ ان کی چند سانسوں کے دھاگے ٹوٹنے سے پہلے پہنچ جائے گی؟ اس نے اپنے شوہر نوید کمانی کو موبائیل لگایا۔ نوید نے کہا—— ''تم فوراً فلائٹ کا ٹکٹ بک کراؤ اور ہندوستان کے لئے روانہ ہو جاؤ۔ کل میری ایک اہم مٹینگ

ہے میٹنگ نپٹا کر میں کل ہی پہنچ جاؤں گا۔''

زویا کو دوسرے دن کا ٹکٹ ملا اُس نے جلدی جلدی کچھ کپڑے بریف کیس میں ڈالے اور شفیق کو فون سے بتا دیا کہ وہ کل پہنچ رہی ہے۔ اس کا ذہن بار بار اپنے والد کی طرف مرکوز ہو جاتا ـــــ بیوی بچے ہونے کے باوجود بھی ابّو نے تنہا ہی زندگی گزاری۔ ایک اکیلا بیمار آدمی تل تل کس طرح زندگی جیا اور آج خدا نہ کرے آخری مرحلے میں ہوں۔ اس کی نظر ہاتھ میں رکھے موبائل کی طرف اُٹھ جاتی کہ کس وقت کسی لرزہ کر دینے والی خبر اسے مل جائے اور وہ لمحہ آہ اور سسکیوں میں تبدیل ہو جائے۔

جمال فاروقی کی طبیعت بگڑتی گئی۔ شفیق نے ڈاکٹر سندیپ مشرا کو فون کیا۔ سندیپ مشرا نے چیک اپ کے بعد کچھ دوائیاں لکھ دیں۔

''اسے دیتے رہو، ویسے اب ان کا آخری وقت ہے۔''

شفیق مالک کے سرہانے بیٹھا رہا۔ سانسوں کے زیرو بیم کو دیکھتا رہا کہ ایک بار جمال فاروقی نے زور کی ہچکی لی اور ان کی روح پرواز کر گئی۔ شفیق زور سے رونا چاہتا تھا مگر اس نے ضبط کر لیا ور سسکیاں لینے لگا۔ اسی لمحہ اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

شفیق نے ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف ثریا بول رہی تھی۔

''.........جمال کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''مالک اس دنیا میں نہیں رہے۔''

ثریا کی آواز میں ہلکی سی جھرجھری ہوئی لیکن فوراً سنبھل گئی اور بولی ـــــ

''شفیق ایسا ہے کہ میں چاہ کر بھی وقت پر نہیں پہنچ سکتی۔ جمال کے تکئے کے نیچے دس ہزار روپیہ رکھا ہوا ہے۔ تم اس روپئے سے دفن کرنے والی تنظیم کی مدد سے تجہیز و تکفین کر دو.........''

●●

پھانس

جاڑے کی سرد رات میں جب ساری دنیا نیند کی گہری آغوش میں پینگیں لے رہی ہوتی نندیتا کسی آسیب زدہ روح کی طرح پورے گھر میں بھٹکتی پھرتی۔ کبھی وہ بے چینی سے اپنی مٹھیوں کو بند کرتی، کبھی کھول دیتی، کبھی دھپ دھپ کرتی گھر کے صدر دروازے تک جاتی گویا اس قید سے آزاد ہو جانا چاہتی ہے۔ بلب کی مدھم روشنی میں اس کا سایہ اس قدر ہیبت ناک معلوم ہوتا کہ کوئی بھی خوف زدہ ہوسکتا تھا۔ دروازے کی طرف جس تیزی سے وہ بڑھتی اسی تیزی سے واپس ہو جاتی اور اپنے کمرہ میں آکر بیچوں بیچ اس طرح کھڑی ہو جاتی جیسے برسوں سے یہیں پر کھڑی تھی۔ کبھی ساری رات بیقراری میں ٹہل کر گزار دیتی۔ کبھی آدھی رات کے گہرے سناٹے میں نندیتا کے تاریک کمرہ سے سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی بھنبھناہٹ سنائی دیتیں۔ یوں بھی ہوا کہ نندیتا اپنے کمرہ میں چپکے چپکے اس طرح کراہتی جیسے کوئی بھاری پتھر اس کے سینے پر رکھ دیا گیا ہو جس کے نیچے بے تاب کراہیں دم توڑ رہی ہوں۔

''آنند تم کب آؤ گے۔ تمہارے نہ آنے سے میری زندگی عذاب بن گئی ہے——'' نندیتا آنند کی تصویر کے سامنے اس طرح کھڑی ہوتی جیسے وہ بالکل سامنے کھڑا ہو—— ''تمہیں کیسے بتاؤں کہ مجھ پر کتنے ظلم ہوئے اور یہ ظلم اپنوں نے ڈھائے ہیں جس کی شکایت میں تم سے بھی نہیں کر سکتی''—— وہ سسک پڑی۔ وہ محسوس کرتی جیسے وہ اس گھر میں مدّتوں سے قید ہے اور رہائی کے آثار بھی نظر نہیں آرہے ہیں۔ آنند پٹنہ میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اسکا چھوٹا بھائی سنتوش دہلی میں بی۔ سی۔ اے۔ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ نندیتا اپنے ساس سسر کے ساتھ گاؤں میں رہتی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر نندیتا نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی ساس کوشیلا دیوی کھڑی تھی۔

''بہو دودھ گرم کر کے اپنے سسر کو دے دینا۔ میں سونے جا رہی ہوں۔''—— کوشیلا دیوی جس تیزی سے اسکے کمرہ میں آئی تھی اسی تیزی سے اپنے کمرہ کی طرف مڑ گئی۔ ساس کا یہ فرمان سن کر اسکا وجود اندر تک کانپ گیا۔ وہ لرز رہی تھی مگر اس نے بمشکل تمام اپنے اندر ہمت یکجا کی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کچن میں داخل ہو گئی۔ دودھ گرم کر کے گلاس میں انڈیلا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سسر کے کمرہ کی طرف قدم بڑھایا۔ اس نے محسوس کیا وہ خود سے نہیں چل رہی ہے بلکہ کوئی زبردستی اس کمرہ کی طرف دھکیل رہا ہے۔ جہاں وہ قطعی جانا نہیں چاہتی ہے۔ اس کا وجود لرز رہا تھا اور پاؤں میں بھی لرزہ طاری تھا۔ کمرہ میں پہنچ کر اس نے دودھ کا گلاس میز پر رکھ دیا۔ ویر پرتاپ سنگھ بستر پر نیم دراز ٹی۔ وی۔ پروگرام دیکھنے میں محو تھے۔ نندیتا نے دودھ رکھ کر جیسے ہی پلٹنا

چاہا ویر پرتاب کی بھاری بھرکم آواز نے اسکے قدم روک دیئے۔

''کہاں جارہی ہو؟''

نندیتا خاموش رہی نہ ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔مگر اس کی آواز پر وہ کانپ ضرور گئی تھی۔ویر پرتاپ بستر سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئے۔

''کیا تم اپنا کام بھول گئی؟''

''بابو جی مجھے معاف کر دیجئے میں روز روز یہ اذیت نہیں جھیل سکتی آپ تو میرے پتا سمان ہیں پھر کیوں مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔''

''ہاہاہا.........تم جسے ظلم سمجھ رہی ہو وہ میرا مشغلہ ہے۔جب میں تمہیں پہلی بار دیکھنے تمہارے گھر گیا تھا اسی دن میری نظر میں تم کھپ گئی تھی اور میں اپنے بیٹے سے شادی کے لئے اس لئے راضی ہو گیا تھا کہ تم میری پسند تھی۔میرا بیٹا آنند تو معصوم ہے بالکل بھولا۔میں جہاں کہتا خوشی سے شادی کر لیتا۔

''بابو جی یہ پاپ ہے بیٹے کی پتنی پر بری نگاہ ڈال کر آپ پاپ کے بھاگی دار کیوں بن رہے ہیں۔ابھی بھی وقت ہے اس کام سے باز آ جایئے اور اپنا دھرم نبھایئے۔''

''اے لڑکی مجھے پاپ اور پنیہ کا پاٹھ نہ پڑھا۔میرے لئے سورگ یہ دنیا ہے جو مزہ لینا ہے لے لو۔کل کس نے دیکھا ہے۔مرنے کے بعد سورگ ملے گا یا نرک وہاں دیکھا جائے گا۔''

ویر پرتاپ سنگھ نے نندیتا کا بازو پکڑا۔اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اسکا وجود لرز سا گیا۔اس نے چاہا ہاتھ جھٹک کر کمرہ سے باہر نکل جائے اور چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دے کے میرا اسسر میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے۔مگر ایسا کرنے سے نہ صرف اس کی زندگی نرک بن جائے گی' بلکہ گھر میں ضرور کسی کا خون ہو جائے گا اور مورد الزام اسے ہی ٹھہرایا جائے گا کہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا۔

وہ خاموشی کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھاتی گئی' جس طرف ویر پرتاپ لے جانا چاہ رہے تھے۔

نندیتا جب اپنے کمرہ میں پہنچی اسکا وجود سسک رہا تھا۔اسکی سانسیں الجھ رہی تھیں۔ایسا لگتا تھا اسکے چہرے سے آسودگی غائب ہو چکی ہے۔رات دن بیقراری اور بے سکونی شاید اس کی تقدیر میں لکھ دی گئی تھی۔وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اپنے سراپا کو دیکھا۔اسکا دل چاہا کہ اپنے جسم کے ان تمام اعضاء کو کھرُچ دے جس کو ویر پرتاپ نے چھوا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکتی تھی۔وہ اسی لمحہ باتھ روم میں گئی ایک جھٹکے سے سارے کپڑے اتار دیئے اور شاور کھول کر اپنے پورے وجود کو بھگونے لگی وہ اپنے بدن کو زور زور سے مل رہی تھی اتنے زور سے کہ وہ حصہ لال ہو گیا۔آنکھیں رو رہی تھیں لیکن پانی کی کثیر تعداد میں آنسو کا وجود کہاں بچ پاتا ہے۔اس طرح بہہ گیا جیسے کوئی شاخ سے ٹوٹا پتہ بہہ جاتا ہے۔

نندیتا جب باتھ روم سے نکل کر اپنے کمرہ میں پہنچی تو موبائیل کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے ٹیبل سے موبائیل اٹھا کر پہلے نام پڑھا پھر کان سے لگایا۔

''میں اتنی دیر سے فون کر رہا ہوں۔ رینگ ہو رہی تھی مگر تم نے اٹھایا نہیں۔ کیا کر رہی تھی۔''

''وہ.........وہ نہا رہی تھی۔''

''اتنی رات میں۔ گھڑی دیکھی ہے رات کے بارہ بج رہے ہیں۔''

''وہ کیا ہے کہ میرا بدن میلا ہو گیا تھا۔''

''بدن میلا ہو گیا تھا۔ یہ کیا کہہ رہی ہو۔''

''بدن نہیں کپڑا میلا ہو گیا تھا۔''

''نندیتا تم عجیب طرح کی باتیں کر رہی ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا!''

''ہاں ٹھیک ہے.........سب ٹھیک ہے۔''

اچھا تم آرام کرو لگتا ہے تم کچھ پریشان ہو۔ کل بات کروں گا۔''

نندیتا موبائل آف کر کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے بالوں سے ابھی بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ کندھے پر رکھے تولئے سے بالوں کو خشک کرنے لگی پھر ڈریسنگ ٹیبل کے قریب آ گئی' بالوں میں کنگھی کیا اور ایک جوڑا بنا کر تولئے کو قریب رکھی کرسی پر پھیلا دیا۔ کمرے کا بلب آف کرنے کے بعد خود کو بستر پر گرا دیا۔

آنند نندیتا سے بات کر کے پریشان سا ہو گیا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ سامنے ٹیبل پر نندیتا کی تصویر فریم میں آویزاں مسکرا رہی تھی۔ آنند نے تصویر کو بغور دیکھا۔ اسکا ذہن نندیتا کا تعاقب کرتا ہوا گاؤں کے اس وسیع و عریض حویلی میں پہنچ گیا جہاں نندیتا ساس سسر کے ساتھ رہتی تھی———

''یہ نندیتا کو کیا ہو گیا ہے آج بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہی تھی۔ میں بھی پاگل ہوں اتنی رات کو فون نہیں کرنا چاہئے تھا۔ گاؤں کے لوگ اتنی دیر تک کہاں جاگتے ہیں۔ یقیناً وہ نیند میں ہوگی۔ خیر چھوڑ و بعد میں بات کر کے خیریت دریافت کر لوں گا۔''

آنند کرسی سے اُٹھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔

صبح ہوئی تو سورج کی روشنی نے رات کے سارے میل دھو دیئے۔ سیاہی روپوش ہو گئی اور رات کو گناہ کرنے والا شخص سفید لباس میں ملبوس دنیا کی نظروں میں سرخرو بن کر گھومنے لگا۔

مگر نندیتا———!

نندیتا کی زندگی سسک رہی تھی۔

راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔
ہر سو اندھیرے کی حکومت مسلط ہو گئی تھی۔
اس کا مستقبل وقت کی آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا۔
وہ ہر لمحہ اپنا احتساب کرتی کہ
اُس کا گناہ کیا ہے؟

ہر لڑکی اپنی آنکھوں میں شادی کے سنہرے خواب سجائے، اپنا سب کچھ چھوڑ کر ایک اجنبی کو اپنا ہم سفر، ہم نوا اور ہمراز بناتی ہے لیکن خوشی اور آسودگی ہر لڑکی کا مقدر نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ نندیتا کے مقدر میں بھی تلخی کے سوا کچھ نہ تھا البتہ اس کے دل میں اُمنگیں اور آرزوئیں سمندر کی لہروں کی طرح ہچکولے لیتی رہتیں۔۔۔۔۔ کبھی آنند کے ساتھ سنہری دھوپ میں بیٹھ کر باتیں کرے، اتنی باتیں کہ جب رات اپنی سیاہ زلف کھول دے تو اس اندھیرے میں اپنا پورا وجود چادر کی طرح اس میں پیوست کردے اور میں میں نہ رہوں بلکہ دونوں مل کر ایک وجود بن جائیں فقط ایک وجود۔

نندیتا کی آنکھوں میں آنند کے ساتھ گزارے ہوئے ایک ایک پل کے نقوش ابھر آتے لیکن یہ یادیں اب ماضی کا ایک باب ہی تو بنتی جا رہی تھیں۔ وہ آنند کو کیسے سمجھائے کہ جب سے تم گئے ہو یہاں چاندنی راتیں نہیں ہوتیں۔ شب و روز وہی ہے۔ وہی معمول ہے مگر زندگی پر ویرانی سی ٹپکتی ہے۔

یہاں پل پل تماشہ ہی تو ہوتا ہے۔ ایک ایسا تماشہ جس کی میں ہی تماشہ گر اور میں ہی تماشائی کہ اگر دوسرا دیکھ لے تو قیامت برپا ہو جائے، زلزلہ آجائے اور اس زلزلے میں میرا وجود زمیں بوس ہو جائے۔ زندگی مجھ کو ہر لمحہ رلا رہی ہے۔ جلا رہی ہے۔ پھر بھی میں جی رہی ہوں۔ غموں کو پی رہی ہوں۔ میری خوشی کا پرندہ ایک ایسے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا ہے جس کے سبھی دروازے کھلے تو ہیں مگر وہ پھر بھی مقید ہے۔ میری پلکوں پہ آنسو تارے کی طرح جھلملا کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں چلتی پھرتی ایک لاش سی بن گئی ہوں۔ اُداسی کے فرشتے ہر قدم میرے ساتھ رہتے ہیں۔ شانہ بہ شانہ جیسے ان کو مجھ پر مسلط کر دیا گیا ہے۔ کیا یہی زندگی ہے؟

یہ تو موت سے بدتر زندگی ہے۔
لیکن میں مر بھی نہیں سکتی۔
میرے مقدر میں تو قطرہ قطرہ جینا لکھا ہے۔

میرے ساتھ جو کچھ گزرتا ہے میں آنند کو بتا بھی نہیں سکتی اگر بتا دیا تو ممکن ہے وہ اپنے باپ کا خون کر دے اور خود پھانسی کے تختے تک پہنچ جائے۔ نقصان تو دونوں حال میں میرا ہی ہے۔ ایک طرف اذیت بھری زندگی ہے تو دوسری طرف شوہر کے کھو جانے کا خدشہ ہے، بھگوان میں کیا کروں تو ہی کوئی راستہ دکھا۔۔۔۔۔

کالج کی چھٹی ہوتے ہی سنتوش گھر واپس آ گیا۔ایک مہینے تک کالج کی چھٹی تھی۔چند روز میں ہی سنتوش کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کی بھابھی کو کوئی چنتا اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔ان کی آنکھوں میں کوئی راز ہے جسے وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہیں۔اس نے محسوس کیا کہ بھابھی کے چہرے سے آسودگی غائب ہو چکی ہے۔انکی خوشی کا پنچھی نہ جانے کہاں ہجرت کر گیا ہے۔سنتوش سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بھابی کو کون سا غم ہے جسے وہ چھپائے اندر ہی اندر گھٹ رہی ہیں۔ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

''بھابی میں جب سے آیا ہوں محسوس کر رہا ہوں آپ میں وہ پہلے جیسی بات نہیں' کوئی غم ہے جو آپ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔بتایئے کیا بات ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سنتوش۔''

''نہیں بھابی کوئی بات تو ضرور ہے۔آپ مجھ سے شیئر کیجئے میں اس کا حل ضرور نکالوں گا۔''

''نہیں سنتوش بس کبھی کبھی من اُداس ہو جاتا ہے۔''

''اسکا مطلب ہے بھیا کی غیر موجودگی آپ کو ستاتی رہتی ہے۔''

''ایسا ہی سمجھو''—— نندیتا نہیں چاہتی تھی کی سنتوش پر کسی طرح ظاہر ہو کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔سنتوش کے آجانے سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ پرتاپ سنگھ محتاط ہو گئے تھے لیکن اندر ہی اندر سنتوش کے آجانے سے خفا بھی تھے اس سے قبل وہ دو چار دن کے لئے ہی آتا تھا لیکن اس بار ایک مہینے کی چھٹی پر آیا تھا۔پرتاپ سنگھ چاہتے تھے کہ سنتوش اتنے دنوں تک یہاں نہ رہے۔سنتوش نندیتا کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔اسے ہنساتا۔ہنسی مذاق کرتا۔اسکے کام میں ہاتھ بٹاتا۔اس طرح نندیتا کا کچھ غم قدرے مختصر ضرور ہوا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ سنتوش کے جانے کے بعد پھر وہی معمول شروع ہو جائے گا۔

ایک دن اچانک بغیر کسی اطلاع کے آنند آ گیا۔نندیتا کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔سنتوش بھی خوش تھا کہ اب بھابی خوش نظر آئیں گی۔آنند کے آجانے سے گھر میں رونق آ گئی تھی لیکن نندیتا کے چہرے پر پھیلی اداسی کی لکیر کو اس نے پڑھ لیا تھا۔اس نے پوچھا—— ''نندیتا تم میں کچھ تبدیلی آ گئی ہے لگتا ہے تم اس گھر میں خوش نہیں ہو۔''

''ایسا تو کچھ نہیں ہے بس آپ کی غیر موجودگی کھلتی رہتی ہے' تنہائی سانپ بن کر کاٹنے کے لئے دوڑتی ہے۔''

''نندیتا تھوڑا انتظار کرو۔میں بابو جی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ بھی میرے ساتھ شہر چلیں۔اگر وہ تیار ہو گئے تو کچھ ہی روز میں چل چلوں گا۔وہاں مجھے کوارٹر مل گیا ہے۔تین کمرے ہیں ایک چھوٹی فیملی کے لئے اور کیا چاہئے۔لیکن بابو جی کی ضد ہے کہ وہ پشتینی مکان چھوڑ کر شہر میں نہیں بسیں گے۔اب انہیں کون سمجھائے کہ شہر میں سب کچھ آسانی سے مل جاتا ہے۔پھر بھی میں اس بار کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔''

نندیتا کچھ نہیں بولی۔اسے پتہ تھا بابو جی کبھی جانے کو تیار نہیں ہوں گے اور وہ پھر وہی اذیت بھری زندگی جینے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ نندیتا کی زندگی میں تھوڑی سی خوشی میسر آ گئی تھی۔ اب وہ خوش رہنے لگی تھی۔ سنتوش بھی اس کا پورا خیال رکھتا تھا۔

وقت کہاں کسی کے روکے رکتا ہے۔ وہ تو بہتا دریا ہے بہتا ہی جاتا ہے مگر اس زد میں نہ جانے کتنے راز آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ایک دن اچانک نندیتا کی طبیعت خراب ہوگئی۔ گاؤں کے ایک ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے چیک اپ کے بعد بتایا۔

''نندیتا ماں بننے والی ہے۔ ایک مہینے کا حمل ہے۔''

یہ سن کر آنند اور سنتوش سکتے میں آ گئے۔ آنند نے سوچا میں گذشتہ تین مہینے کہ بعد آ رہا ہوں یہ حمل کس کا ہے۔ سنتوش کو بھی پتہ تھا کہ بھیا پچھلے تین مہینے سے نوکری کے سلسلے میں ٹور پر تھے البتہ پرتاپ سنگھ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اب اس کی ذلیل حرکت کا پردہ فاش ہونے والا تھا۔ اس کا دماغ تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ آنند نے نندیتا کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''نندیتا میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں تین مہینے کے بعد گھر لوٹا ہوں پھر یہ بچہ کس کا ہے؟''

''نندیتا کو کاٹو تو خون نہیں۔ کچھ ہی پل میں قیامت صغرا کا منظر سامنے آنے والا تھا۔ گھر میں ایک ایسا زلزلہ آنے والا تھا کہ گھر کا پورا شیرازہ بکھرنے والا تھا۔''

''نندیتا میں نے کچھ پوچھا ہے۔ بتاؤ تمہارے پیٹ میں کس کا بچہ پل رہا ہے۔''

''وہ.........وہ.........وہ.........''

''یہ کیا بتائے گی میں بتاتا ہوں۔''——— پرتاپ سنگھ اپنے چہرے پر بناوٹی غصہ لاتے ہوئے آگے بڑھے۔'' مجھے اس کے چرتر پر پہلے ہی سے شک تھا۔''

''پتا جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔——— بھابی پر غلط الزام لگا رہے ہیں''——— سنتوش نے باپ کو روکنا چاہا۔

''تو چپ رہ.........میں سب جانتا ہوں جب سے تو آیا ہے تیرے اور تیری بھابی کے بیچ میں کیا چکر چل رہا ہے۔''

''پتا جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں بھابی کو ماں سمان سمجھتا ہوں' کبھی ان پر بری نگاہ نہیں ڈال سکتا.........''

''اور کمرہ میں دیر رات تک ہنسی مذاق کون کرتا تھا۔''

''پتا جی ہنسی مذاق اور بات ہے لیکن اتنا بڑا الزام.........اس طرح کی بات میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔''——— سنتوش رو پڑا۔

''آنسو بہانے سے گناہ پر پردہ نہیں پڑتا سنتوش.........آنند تیری پتنی کے پیٹ میں سنتوش کا ہی بچہ پل رہا ہے۔''

آنند غصے سے بپھر پڑا اور سنتوش کی طرف بڑھا لیکن نندیتا دونوں کے بیچ آ کر کھڑی ہوگئی۔

''سچ سننا چاہتے ہو تو سنو.........''

●●

صنم آشنا

وہ ایک لمحہ ــــــ'

جب گھٹائیں برس رہی تھیں؛

زمین کے سینے پہ ساری فصلیں مچل رہی تھیں۔'

سبز سبز موسم ہر طرف کھلکھلا رہا تھا۔

لیکن عامر کے دل کی زمین میں چھوٹی بڑی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔نظر کی حد تک کسی سمت کہیں بھی موسم سبز نہیں تھا۔ اسکی خوشی کی ساری فصلیں غم کی شدّت نے جلا کر راکھ کر دی تھیں۔

اکثر شام کے سرمگیں دھندلکے میں ایک سسکی اسکے کانوں میں سرگوشی کرتی' وہ سرگوشی سن کر دم بخود ہو جاتا جیسے پرندے درخت سے کسی خوف ناک آواز سن کر پرواز کر جاتے ہیں۔وہ سرگوشی کرتی اسکی بیوی نازلی کی ہوتی۔

''آخر مجھ میں کیا کمی ہے جو آپ مجھ سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔''

عامر کئی پل خاموش رہا جیسے اس نے نازلی کی بات سنی نہ ہو جب کوئی جواب نہ ملا تو نازلی آگے بڑھی ــــــ

''بتایئے نا آپ مجھ سے کھنچے کھنچے کیوں رہتے ہیں۔مجھ سے نظریں کیوں نہیں ملاتے۔''

عامر نے ایک اچٹتی نگاہ نازلی پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے کمرہ سے نکل گیا وہ زیادہ دیر تک اسکا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک تنہا رہنا چاہتا تھا وہ تنہائی میں اکثر سوچتا.........

روز و شب کی کوشش کے باوجود' نازلی میں تمہیں دل و جان سے اپنا نہیں سکا۔آج بھی دریدہ بادبانوں کے ہمراہ بہتا ہوا اجنبی سمندر میں کسی کو پکارتا محسوس کرتا ہوں۔اسکا سحر مجھے تم سے بہت دور لے جاتا ہے۔شاید اس لئے تم میرے پاس ہو کر بھی نہیں ہوتی۔میں جانتا ہوں شوہر اور بیوی محض ایک رشتہ نہیں زندگی کی سانس ہے کہ سانس رُک جائے تو زندگی ٹھہر جائے اور ہم دونوں کے

درمیان جیسے زندگی ٹھہرسی گئی ہے۔

عامر حیات ایک کہانی کار ہے، جس نے زندگی کی تلخ حقیقت کو کہانی بنادیا تھا۔ اسکے قارئین کا ایک بڑا حلقہ تھا۔ لوگ اس کی کہانی کا انتظار کرتے تھے اس کی کہانی کی ہیروئن اتنی نرم ونازک اور حسین ہوتی کہ قاری اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا۔ عامر حیات جب کہانی لکھتا ایک حسین پیکر اسکے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا۔

''میں تمہاری تخلیق ہوں۔ تم نے اپنے تصور سے مجھے جنم دیا ہے۔''

وہ حسین پیکر ہر لمحہ اسکے ساتھ رہتا۔ جب عامر حیات راہ میں چلتی کسی حسین لڑکی کو دیکھتا تو اپنے حسین پیکر سے اسکا مقابلہ کرتا۔ راہ چلتی لڑکیوں میں کوئی نہ کوئی خامی اُسے ضرور نظر آجاتی۔

اس لڑکی کے بال مختصر ہیں۔

لیکن میرے حسین پیکر کی زلف کتنے دراز اور خوبصورت ہے۔

اس لڑکی کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں ہے۔

میرے حسین پیکر کی آنکھوں میں جادو ہے۔ جب وہ آنکھیں کھولتی ہے تو لگتا ہے ان آنکھوں میں ڈوب جاؤں۔

اس لڑکی کا سراپا.........؟

نہیں نہیں میرے حسین پیکر سے کوئی مقابلہ نہیں۔

کہانی کار کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اسکے گھر والوں نے اسکی شادی طے کردی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد کہانی کار کے دل میں بھی آرزوئیں چپکے چپکے انگڑائیاں لینے لگیں۔

میری بیوی حسن کا مجسمہ ہوگی۔

اسکے زلف سیاہ مائل دراز ہوں گے۔

اُسکی آنکھیں مخمور ہوں گی۔

رخسار گلابی، گردن صراحی دار، ستواں ناک، کمر ناگن سی اور رنگ گندمی۔ بالکل اسکے تصور والا حسین پیکر اسکے تصور کی دنیا سے نکل کر اسکی شریک حیات بن جائے گی۔ لیکن جب وہ حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اس کے تصور کی ساری چھتیں ایک دھماکے کے ساتھ زمیں بوس ہوگئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں میں پہلی بار ایک چبھن محسوس کی۔ چراغ کی لو ٹمٹما کر بجھ گئی مگر اس کی آنکھیں جلتی رہیں۔ وہ نازلی کو بغور دیکھے جاتا۔ وہ مسکرا رہی تھی مگر عامر چپ تھا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ نازلی کی ہنسی ناگوار گزر رہی تھی۔

عامر اور نازلی ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کر رہے تھے مگر دونوں کے درمیاں ایک لکیر سی کھنچی ہوئی تھی۔ عامر اُداس رہنے لگا۔ اُسے رہ رہ کر حسین پیکر یاد آجاتا جس کے ساتھ وہ ہر لمحہ رہتا تھا البتہ کچھ دنوں سے حسین پیکر آہستہ آہستہ معدوم ہوتا جارہا تھا مگر اسکا حسن اُسکی آنکھوں میں کھپ گیا تھا۔

رات بہت تیز ہوا چلی تھی۔ بارش بھی ہوئی تھی اور اس بارش میں نازلی کے سارے ارمان بہتے جارہے تھے۔اس کے سامنے ایک ایک پل اس طرح گزر رہے تھے جیسے برس گزرتے جارہے ہوں۔ایک اُجاڑ بے رس زندگی' وہ پریشان تھی کہ عامر اس سے فرار کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے آخر اس میں کیا کمی ہے ایک عام لڑکی کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔وہ اُس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے پھر بھی عامر اُس کی مٹھی سے ریت کی طرح پھسل رہا تھا۔

عامر کے وجود میں کوئی بے چین پرندہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔لمحوں کی قید میں گھرا وہ خود کو بے چین پرندہ محسوس کرتا ہے کہ اسکا حسین پیکر کہاں غائب ہوگیا۔نازلی کے وجود میں وہ پیکر کیوں کر نہ سما سکا۔جب تک وہ گھر سے باہر رہتا سکون محسوس کرتا لیکن جیسے ہی گھر کے دروازے پر پہنچتا اس کی سانسیں لرزنے لگتیں۔آنکھیں کانپ جاتیں۔وہ تھرتھراتے ہاتھوں سے دروازے پر دستک دیتا۔اس کے من میں اداسی کی ایک گاڑھی لکیر کھینچ جاتی۔دروازہ اسکی بیوی نازلی کھولتی'مسکرا کر خیر مقدم کرتی لیکن نازلی پر نظر پڑتے ہی اس کی اداسی میں اضافہ ہو جاتا۔اس کے وجود کا ہر انگ پسینے کی بوندوں کی سردی بھری فضا میں تھرتھرانے لگتا۔وہ سوچتا یہاں سے بھاگ جائے۔اس نے بھاگنا چاہا لیکن بھاگنا مشکل تھا۔اس کا درد اور گہرا ہو گیا۔اس کی آنکھیں مند گئیں۔ نازلی دروازے سے ہٹ گئی۔عامر اندر کمرہ میں آ گیا۔نازلی مسکرا کر بالکل اس کے قریب آ گئی اور اپنی گوری گوری باہیں اسکی گردن میں حائل کر دیں۔عامر چونک پڑا۔اس نے آہستہ سے اسکا ہاتھ پکڑ کر خود کو الگ کر لیا۔عامر کو نازلی کے وجود میں اس ٹھنڈک کا احساس نہیں ہوا جس کا وہ متمنی تھا بلکہ سورج کی تپش' آسمان کی دھند کا احساس ہوا' ساتھ ہی ساتھ اس کی روح میں ایک کانٹا چبھتا ہوا محسوس ہوا۔نازلی کو اس کا جھٹکنا قطعی اچھا نہیں لگا۔وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔

''آخر آپ مجھ سے دور دور کیوں رہنا چاہتے ہیں۔مجھ میں ایسی کیا کمی ہے نہ ڈھنگ سے بات کرتے ہیں نہ ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں اور نہ ہی مجھے ایک بیوی کا حق دے رہے ہیں۔''

عامر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔وہ کیا جواب دے۔نازلی کو دیر تک پڑھنے کو کوشش کی کچھ کہنا چاہا لیکن وہ پتھر کی طرح خاموش رہا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔نازلی پھر بولی۔

''آپ کچھ بولتے کیوں نہیں۔جب تک آپ بتائیں گے نہیں میں آپ کو سمجھ سکوں گی اور نہ آپ مجھے۔میں آپ کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں لیکن آپ کا رویّہ دیکھ کر اکثر میرے اندر ایک خوف سرایت کر جاتا ہے۔اس طرح تو ہملوگوں کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو جائے گا۔میرے اندر کوئی کمی ہے تو آپ اس کا برملا اظہار کریں میں اُسے دور کرنے کی کوشش کروں گی۔''

عامر اسی طرح خاموش رہا البتہ اب اس کی نگاہ نازلی کے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔وہ کئی پل یوں ہی کھڑا رہا خاموش۔ اس کے پاس سے کئی موسم گزر گئے۔جاتے جاتے ایک جملہ بول گیا۔

''میرے تصور میں ایک حسین پیکر ہے جس کے سحر سے میں باہر نہیں نکل پا رہا ہوں۔''

سورج ڈوب چکا ہے رات قدم رکھ چکی ہے عامر کے اندر ایک انجانہ سا خوف سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اسے نازلی کا وہ جملہ بار بار اسکے ذہن پر دستک دے رہا ہے——اس طرح تو ہملوگوں کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو جائے گا''——وہ گھبرا گیا۔ اُسے آنے والے وقت سے ڈر لگنے لگا۔ ہوا تیز اور تیز چلنے لگی اس نے سوچا——''میں ایک کہانی کار ہوں اور فنکار کسی کا دل نہیں دکھاتا' لیکن کہیں ایسا تو نہیں وہ نازلی کو نظر انداز کر کے اس پر ظلم کر رہا ہے۔ اذیت پہنچا رہا ہے آخر اس کا قصور کیا ہے مگر وہ کیا کرے اس کا حسین پیکر ہر وقت اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا اور تب نازلی اسے ایک معمولی سی لڑکی محسوس ہوتی ہے۔

نازلی کو بھی شدّت سے اپنی محرومی کا احساس ہوتا وہ سوچتی اس کا گناہ کیا ہے۔ وہ بھی ہر لڑکی کی طرح اپنی پلکوں پہ کئی خواب سجائے عامر کی زندگی میں داخل ہوئی تھی مگر اسے کیا پتہ تھا کہ اس کے مجازی خدا نے ایک ایسا بت تراش کر اپنے من مندر میں قید کر رکھا ہے جس کے سحر سے وہ باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا۔ وہ اس بت کو آخر کیسے توڑے——نازلی سوچتے سوچتے تھک گئی اور اسے نیند آ گئی۔

نازلی پر حقیقت عیاں ہونے کے بعد اس کے درد میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا اس کے وجود کے آس پاس کوئی پیڑ نہیں ہے' بس صحرا ہے اور وہ تن تنہا صحرا میں کھڑی ہے۔ اسکے ہونٹ سوکھ چکے ہیں پیاس سے اور آنکھیں جل رہی ہیں آگ سے۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر ہولے سے کہتی ہے——

''عامر میرے پاس آؤ.........میں تمہیں ان دیکھا سکھ دوں گی!''——لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ کوئی بھی تو نہیں تھا جو اسکی مرمریں بانہوں میں آ چھپتا اور اسے بتاتا۔

''نازلی تمہاری بانہوں میں آ کر میں نے جیسے جنت پا لیا ہے!''——

نازلی سمجھ رہی تھی اس کے گھر میں ایک چھوٹا سا اندھیرا گھس آیا ہے جس نے نہ صرف گھر کو تاریک تر بنا دیا ہے بلکہ اُسکے وجود میں اندھیرے کا زہر گھول دیا ہے۔ اس کا گھر سائیں سائیں کر رہا ہے۔ کہیں سے بھی کوئی آواز نہیں ساری آوازیں نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں۔ قربتوں کا وہ حسین موسم نہ جانے کب آئے گا جس کی وہ متلاشی ہے۔ وہ تو اپنے ہی گھر میں دربدر ہو کر رہ گئی ہے۔ اُس نے عامر کو سمجھایا——

''آپ تصور میں بنائے ہوئے بت کو توڑ دیجئے۔ وہ کلپنا کی دنیا ہے حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ حقیقت میں ہوں جو آپ کے سامنے آپ کی بیوی کی شکل میں کھڑی ہوں جیتا جاگتا وجود۔ میں سمجھتی ہوں ہر کہانی کار ایک حسین پیکر تخلیق کرتا ہے اور عملی زندگی میں اس کو شامل کرنا چاہتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ کہانی کار بہت محنت کر کے ایک حسین پیکر تخلیق کرتا ہے جو سب سے جدا ہوتا ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی مگر حقیقت کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا اس لئے آپ اس تصور کے اس بت کو توڑ دیجئے اور حقیقت کا سامنا کیجئے۔ حقیقت صرف میں ہوں' میں آپ کی بیوی ہوں' میں جیسی بھی ہوں آپ کی زندگی ہوں۔''

نازلی کی باتوں کا عامر پر خاصہ اثر ہوا تھا۔ اب وہ نازلی کے بارے میں سوچنے لگا تھا——

’’نازلی میری بیوی ہے لیکن کیا ہملوگوں کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے؟ آہستہ آہستہ رشتوں کے بیچ خلیج تو پیدا نہیں ہورہی ہے؟ فاصلوں کا سمندر وسیع ہوتا جارہا ہے۔ اگر میں نے اس خلیج کو نہیں پاٹا تو کہیں یہ رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم نہ ہوجائے۔ اب کچھ بھی ہو مجھے نازلی میں ہی اپنے پیکر کو تلاش کرنا ہوگا۔ اس تصوراتی پیکر کو ہٹا کر اپنے من مندر میں نازلی کا بت.........نہیں نہیں اب میں کوئی بت نہیں بناؤں گا۔ نازلی کوئی بت نہیں جیتا جاگتا وجود ہے جو میرے سکھ دکھ میں قدم سے قدم ملا کر چلنے کو ہر وقت تیار ہے۔

رات کا پچھلا پہر بھیگ رہا تھا۔ عامر سوچتے سوچتے ایک نتیجہ پر پہنچ چکا تھا۔ اُس نے کروٹ بدلی تو دیکھا نازلی دوسری طرف منہ کئے سورہی ہے۔ آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا کر جیسے ہی بازو پکڑا' نازلی کروٹ بدلتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے وہ خاموش رہی۔ اس نے عامر کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھو میں پیار کی موجیں آہستہ آہستہ لہرا رہی تھیں۔ نازلی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے۔ عامر نے اپنے ہاتھوں سے اسکے بہتے آنسوؤں کو خشک کیا اور اپنے سینے پر بچھالیا۔

●●

میں دامنی نہیں ہوں

شام نے اپنے چہرے پر کالک مل کر اپنی سیاہی کو اور زیادہ سیاہ کرلیا' رات دھیرے دھیرے اپنا پاؤں پھیلانے لگی۔ رات جب آتی ہے تو دن بھر کا تھکا ماندا انسان اپنی تکان مٹانے کے لئے اپنے تھکے بدن کو بستر پر پھیلا کر آرام کی نیند سوجاتا ہے مگر شہر کے کچھ علاقے ایسے ہوتے ہیں جو بارہ بجے کے بعد جاگتے ہیں۔شیواجی اسٹیڈیم سے لے کر گول مارکیٹ کی سڑک بارہ بجے کے بعد جاگ جاتی ہے۔جسم بیچنے والی عورتیں زرق برق لباس میں گہرا میک اپ کئے رکشے پر سوار شیواجی اسٹیڈیم سے لے گول مارکیٹ کی سڑک پر گھومتی رہتی ہیں۔خواہش مند حضرات رکشہ روک کر اس عورت سے بات کرتے ہیں۔سودا طے ہوجانے پر وہ عورت یا تو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یا کار میں بیٹھ کر اس کے ساتھ روانہ ہوجاتی ہے رات بھر جاگنے کے لئے' ایسی عورتوں کے لئے رات سونے کے لئے نہیں جاگنے کے لئے ہوتی ہے۔جاگنا اس کا مقدر ہوتا ہے۔کاتب وقت نے دی ہے اسے جاگنے کی سزا۔ دوہ جاگ رہی ہے اور رات آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں موندرہی ہے۔

آج کی رات بھی سورہی ہے اور ساتھ ہی شیواجی اسٹیڈیم کا علاقہ بھی سورہا ہے۔اس علاقے میں پولس کی گشت بڑھادی گئی ہے۔مارے خوف کے وہ عورتیں آج گھر سے باہر نہیں نکلی ہیں۔ضرورت مند حضرات آدھی رات کے بعد ایسی عورتوں کی تلاش میں نکلے مگر ناکامی ہاتھ لگی۔

ایک کار میں چار نوجوان ایسی عورتوں کی تلاش میں دلّی کی سڑکوں پر کار دوڑاتے پھر رہے ہیں لیکن ہر جگہ ناکامی کا چراغ بجھتا نظر آرہا ہے۔رات آہستہ آہستہ اپنے پیر پھیلا رہی ہے۔ان نوجوانوں کی شدّت میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔شراب کی کئی بوتلیں خالی کر چکے ہیں لیکن جسم کو حاصل کرنے کا نشہ دماغ میں کیڑے کی طرح کلبلا رہا ہے۔اچانک ان کی نظر سڑک کے کنارے کپڑے کو ڈال کر جو آشیانہ بنایا گیا تھا اُس پر پڑتی ہے۔ان میں سے ایک نوجوان نے کہا——

''راہل گاڑی روکو!''——راہل نے گاڑی روک دی۔

''اترو!''——سنجے نے کپل اور مونٹی سے کہا۔

تینوں کار سے اتر گئے۔

''دیکھو سامنے والی جھونپڑی میں ضرور کوئی لڑکی مل جائے گی''——— سنجے نے جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن اس میں تو ریڈ لائٹ پر بھیک مانگنے والی بھکارن رہتی ہے''——— کپل نے حقارت سے کہا۔

''ذات بھکاری کی ہو لیکن جسم تو سبھی عورتوں کا ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ رات گزارنے سے مطلب۔ جسم چاہے بھکارن کا ہو یا شریف زادی کا سب ایک ہی مزہ دیتا ہے''——— سنجے آگے بڑھا اور کپڑے کا پردہ اُوپر کی طرف الٹ دیا۔ اندر جھونپڑی میں ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کی جواں سال بیٹی سو رہی تھی۔ دونوں جاگ گئیں۔

''کون ہے؟''——— ادھیڑ عمر عورت سکھیا نے چونک کر کہا۔ اس کی آواز سن کر اس کی بیٹی سگنی بھی جاگ گئی۔

''کون ہے ماں؟''

سنجے نے ٹارچ جلا کر دونوں ماں بیٹی کو دیکھا اور کہا———

''کپل لڑکی کو اٹھاؤ اور کار میں ڈالو''———

یہ جملہ سن کر دونوں ماں بیٹی سہم گئیں دوسری طرف کا پردہ ہٹا کر سگنی جھونپڑی سے باہر آ گئی اور سنسان سڑک پر بے تحاشہ بھاگنے لگی۔ سنجے، کپل اور مونٹی اس کے پیچھے بھاگے۔ کچھ ہی دور جا کر تینوں نے سگنی کو دبوچ لیا۔ راہل نے کار اس کے پاس ہی روکا، تینوں نے زبردستی اسے کار میں ڈالا۔ وہ چیخ رہی تھی مگر ان لوگوں نے اس کا منھ بند کر رکھا تھا۔ بعد میں منھ پر کپڑا باندھ دیا لیکن اس کے جسم کو کپڑے سے آزاد کر دیا اور چاروں مل کر اس کے جسم کو چیل کوے کی طرح نوچتے رہے اور جب نوچ نوچ کر سیر ہو گئے تو کار سے نیچے سڑک پر پھینک دیا۔ سگنی کا پورا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خون رس رہے تھے۔ وہ برہنہ پڑی تھی۔ رات بھر اسی طرح برہنہ پڑی رہی اگر کبھی کبھی کوئی کار یا بائیک والا اس سڑک سے گزرتا تو وہ بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کی ماں سکھیا رات بھر سڑکوں پر اپنی بیٹی کو تلاش کرتی رہی اور جب وہ صبح میں ملی تو رات اپنی سیاہی چھپا کر روپوش ہو گئی تھی لیکن سگنی دنیا سے روپوش ہو گئی تھی۔ سکھیا نے اپنی ساڑی اتار کر اس کے ننگے جسم پر ڈال دیا اور چلانے لگی۔

''ظالموں نے میری بیٹی کی عزت لوٹ کر مار ڈالا......... مار ڈالا حرامزادوں نے..........عزت کے ساتھ جان بھی لے لی میری بیٹی کی''———

سڑکوں پر آمد و رفت شروع ہو گئی تھی لیکن کوئی بھی اس کی آواز سننے کو تیار نہیں تھا۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی لاش اٹھائے پولس اسٹیشن پہنچ گئی۔

''حضور، چار رئیس زادوں نے میری بیٹی کو میری جھونپڑی سے اٹھا کر لے گئے۔ اس کی عزت بھی لوٹی اور جان سے مار بھی ڈالا۔''

انسپکٹر ہنسا——— ''اب تم لوگوں کی بھی عزت رئیس زادے لوٹنے لگے۔ بس میں کوئی اکیلی لڑکی نہیں ملی جو تمہاری بیٹی کو اٹھا لیا۔ دلّی میں نہ جانے کتنی لڑکیا بس میں اکیلی سفر کرتی مل جائیں گی۔ اب تم لوگوں کے لئے بھی پولس حرکت میں آ گئی تو ان

شریف لڑکیوں کی رپورٹ کون لکھے گا جو ہر روز لٹ رہی ہیں۔ان کی تفتیش کون کرے گا؟.........چل بھاگ یہاں سے.........
سڑک کے کنارے لاش کو رکھ دینا.........لوگ ترس کھا کر ہزار پانچ سو روپیہ دے ہی دیں گے۔اسی سے جلا دینا۔‘‘

سکھیا اپنی بیٹی کی لاش لے کر ایک میڈیا والے کے پاس گئی۔

’’آپ تو میڈیا والے ہیں.........میری بیٹی کی عزت لوٹی گئی اور اسے جان سے بھی مار ڈالا ظالموں نے.........آپ اپنے چینل پر اس رپورٹ کو دکھایئے تا کہ میرے ساتھ انصاف ہو سکے.........ظالموں کو سزا مل سکے‘‘

میڈیا والا زیرلب مسکرایا——’’تیری بیٹی کوئی دامنی تھوڑی ہی تھی یا اسکول میں پڑھنے والی وہ کم سن لڑکی بھی نہیں تھی جس کی عزت لوٹی گئی ہے۔تیری عزت کی قیمت ہی کیا ہے جو خبر بناؤں.........تمہاری رپورٹ سے میرے چینل کا ٹی۔آر۔پی۔ بھی نہیں بڑھے گا.........جاؤ‘ اس لاش کو جلانے کا انتظام کرو۔میری طرف سے یہ سو روپیہ رکھ لو‘لاش کو جلانے میں کام آئے گا۔‘‘

سکھیا نے وہ روپیہ تو نہیں لیا البتہ اپنی بیٹی کی لاش لئے ایک لیڈر کے پاس پہنچ گئی۔

’’حضور میری بیٹی کی عزت.........اور جان.........‘‘

لیڈر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے سکھیا کی طرف دیکھا——

’’اگر تمہاری جیسی عورتوں کو پولٹیکل اِشو بنایا گیا تو کتنی جنتا میرے ساتھ اترے گی۔دامنی میڈیکل کی چھاترا تھی اس لئے لوگوں کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ پورے ہندوستان میں تحریک نے زور پکڑا اور سرکار کو قانون تک بنانا پڑ گیا.........نہیں نہیں.........تمہارے اِشو پر ہم کوئی تحریک نہیں چلا سکتے.........جاؤ اور اس کا انتم سنسکار کرو.........لو میری طرف سے یہ پانچ سو روپیہ رکھ لو.........بھگوان تمہاری بیٹی کی آتما کو شانتی دے.........‘‘

لیڈر اندر کمرے میں چلا گیا اور آپ ہی آپ بُد بُدایا——’’یہ شریف زادے بھکارن کو بھی نہیں بخشتے.........اگر اتنا ہی جوش چڑھا تھا تو کسی ہوٹل میں چلے جاتے.........رام رام کیسا جُگ آ گیا ہے.........‘‘

مجبوراً سکھیا روہانسی ہو کر لاش کو اپنی جھونپڑی کے قریب سڑک پر رکھ کر ایک چادر سے ڈھک دیا اور پاس ہی بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کی برادری کے چند لوگ بھی اب اس کے پاس آ گئے تھے اور لاش کو جلانے کے بارے میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
پیدل چلنے والے مسافر اس لاش کو دیکھتے۔ روتی بلکتی ماں کو دیکھتے اور اپنی جیب سے کچھ سکے اس لاش پر اچھال کر آگے بڑھ جاتے۔

●●

کاہے کو بیاہی بدیس

زندگی ایک دائرہ ہی تو ہے۔عدم سے عدم تک سفر میں مصروف ہے——‘

انسان کسی نہ کسی بہانے سے اس دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس دائرے میں اس وقت تک چکر لگاتا رہتا ہے جب تک اس کی زندگی کا سورج غروب نہیں ہو جاتا۔

دائرہ کبھی کاغذ پر بنتا ہے کبھی کاغذ کے باہر۔کاغذ پر بنا دائرہ مٹ سکتا ہے مگر کاغذ کے باہر کا دائرہ توڑنے کے لئے جدو جہد کرنی پڑتی ہے جو توڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اپنا ایک نیا دائرہ بنا لیتا ہے اور جو کامیاب نہیں ہوتا وہ اسی دائرے میں چکر لگاتا رہتا ہے۔

ایک مکان کے وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں پانچ بھائی ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے ہیں۔ان کی ماں کو دنیا چھوڑے ایک سال کا وقفہ گزر چکا ہے اور باپ تو پانچ سال پہلے ہی سورگ میں پناہ لے لی تھی۔ایک سال تک پانچوں بھائیوں نے گھر گرہستی تو کسی طرح سنبھال لی لیکن اب اس گھر میں ایک عورت کی موجودگی کا احساس شدّت سے سبھی بھائی محسوس کر رہے تھے۔ خاموشی کی مدّت جب طویل ہوگئی تو چھوٹے بھائی شیام نے خاموشی کے سمندر میں اپنے الفاظ کا پتھر پھینکا۔

’’آپ لوگ اسی طرح خاموش بیٹھے رہیں گے یا کسی نتیجے پر پہنچیں گے بھی۔‘‘

چاروں بھائیوں نے شیام کی طرف دیکھا۔بڑے بھائی وکرم نے کھنکھار کر کہا——

’’مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے شادی کون کرے گا؟‘‘

’’آپ گھر میں سب سے بڑے ہیں اس لئے شادی بھی آپ ہی کریں گے‘‘—— منجھلے بھائی موہن نے چھوٹتے ہی کہا۔

’’نا بابا نا.........میں شادی بیاہ کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا۔بابا کا چھوڑا ہوا اتنا سارا کھیت ہے،باغ ہے،اسے کون دیکھے گا۔کھیت میں،باغ میں ہر روز کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہی ہے۔اس لئے مجھے چھوڑ دو.........‘‘

وکرم اپنا دامن بچا کر اس طرح نکلنا چاہا،جس طرح کبھی کبھی کوئی مچھلی جال توڑ کر نکل جاتی ہے۔

’’تو پھر منجھلے بھیا شادی کر لیں‘‘—— تیسرے بھائی سنتوش نے موہن کی طرف دیکھ کر کہا جو بیٹھا کسی کاغذ کو پڑھ رہا

تھا۔اپنا نام سن کر اس نے کاغذ سے نظر اٹھا کر سنتوش کی طرف دیکھا۔

''مجھے کہاں پھنسا رہے ہو سنتوش.........میں تو بابا کی فیکٹری میں اپنا سر کھپا تا رہتا ہوں.........فیکٹری کو ابھی بہت آگے لے جانا ہے۔ بابا کا یہی خواب تھا۔اس لئے مجھے بخش دو۔''

موہن شادی کے نام پر اس طرح بھاگا جیسے کوئی زہریلا سانپ اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

''تو پھر سنتوش بھیا ہی شادی کریں گے۔ فیصلہ ہو گیا''——چوتھا بھائی منوج یہ جملہ بول کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے فیصلہ ہو گیا ہو۔اس نے آگے بڑھ کر فریج سے ایک بوتل نکال کر پانی پینے لگا۔

''تم کون ہوتے ہو فیصلہ کرنے والے۔ میں تم سے بڑا ہوں اور پیشے سے وکیل بھیہوں۔ میں دن بھر کورٹ میں مغز ماری کرتا رہتا ہوں پھر موکل سے الجھتا رہتا ہوں۔ مجھے فرصت کہاں گرہستی سنبھالنے کی۔اس لئے شادی تم ہی کرو۔''

سنتوش نے اپنی وکالت کا رعب دکھا کر گیند منوج کے پالے میں پھینک دیا۔

''نہیں میں نہیں کرنے والا۔ میں فلموں میں اپنا قدم جمانے کے لئے ممبئی آتا جاتا رہتا ہوں۔ میں پہلے اپنا کیریر بناؤں گا پھر شادی کے بارے سوچوں گا اور اگر شادی کی بھی تو کسی ہیروئن سے ہی کروں گا۔''

منوج نے بھی اپنا دامن اس طرح جھاڑ لیا۔جیسے کوئی اپنے دامن سے گرد جھاڑتا ہے۔

''تو پھر کون کرے گا شادی؟''——سنتوش نے گرج کر کہا۔جیسے اس کے حق میں فیصلہ ہونے والا ہو۔

''تم لوگ اس طرح نہ الجھو.........میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔شیام گھر میں سب سے چھوٹا ہے۔ بی۔اے۔ پاس کر کے نوکری کی تلاش کر رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اسے نوکری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہمارے پاس اتنا سب کچھ ہے وہ ہم پانچ بھائیوں کا ہی تو ہے تو میرا فیصلہ یہ ہے کہ شیام شادی کرے گا اور ہم لوگ بابا کا چھوڑا ہوا سارا کھیت' بزنس سنبھالیں گے۔''——وکرم نے فیصلہ سنا دیا۔

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا''——تینوں بھائیوں نے ایک ساتھ کہا اور سبھی کے چہرے پر خوشی کی لکیریں ابھر آئیں کہ وہ شادی سے بچ گئے۔

''شیام تمہیں کچھ کہنا ہے''——سنتوش نے کچھ لمحہ رک کر پوچھا۔

''شیام کافی دیر خاموش رہا پھر گویا ہوا——

''جب آپ لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے اعتراض کیا ہو سکتا ہے۔آپ سب لوگ گھر میں بڑے ہیں۔آپ کے فیصلے کا احترام کرنا میرا فرض ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے''——شیام اتنی جلدی مان جائے گا کسی کو یقین نہیں تھا۔ذرا بھی چوں چرا نہیں کیا۔

''تو ٹھیک ہے جلد ہی لڑکی تلاش کی جائے اور اس گھر میں شہنائی بجوائی جائے''——منوج نے کھڑے ہو کر کہا۔

سبھی بھائی اٹھ کر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور شیام اپنے کمرہ میں لوٹ آیا۔ وہ شادی کے تصور میں کھو گیا۔ وہ عمر میں سب بھائیوں سے چھوٹا تھا اور دنیا داری کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ چاروں بھائی اس سے بے حد پیار کرتے تھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتے جو چاہتا مانگ لیتا اور سبھی بھائی اس کی ہر خواہش پوری کرتے رہتے۔

چند مہینوں کی کوشش کے بعد چاروں بھائیوں نے چنچلا کا انتخاب کیا۔ شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ سبھی بھائی مل کر شادی کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ زمانے کے بعد اس گھر میں خوشی نے دستک دی تھی اور اس خوشی کو گھر کا ہر فرد انجوائے کر رہا تھا۔ آج شیام کا گھر برقی قمقموں سے سجا تھا۔ شہنائی بج رہی تھی۔ گھر میں روشنی کی برسات ہو رہی تھی اور شیام کے دل میں بھی چنچلا کو پانے کی خواہش کا چراغ جل بجھ رہا تھا۔ شادی بحسن وخوبی انجام پا گئی۔

شیام جب چنچلا کے کمرہ میں پہنچا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ کس طرح چنچلا کا سامنا کرے گا۔ کیا کہے گا اس سے۔ وہ مجھ سے کیا بات کرے گی۔ گھر میں کوئی بھابھی نہیں تھی جو اسے دلہن کے ملن کے بارے میں کچھ بتاتی۔ شیام ڈرتے ڈرتے کمرہ میں گیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ چنچلا گھونگھٹ میں تھی۔ جب کافی دیر تک شیام کچھ نہ بولا تو چنچلا نے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔ اس نے شیام کو دیکھا۔

''آپ اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں۔ پاس آیئے نا.........''

شیام ڈرتے ڈرتے اس کے پاس گیا۔ اس نے اس کے معصوم چہرے کو دیکھا۔ چہرہ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا حسن اور جوانی کی جیتی جاگی تصویر بیٹھی ہے۔

''میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ پر میرا پورا ادھیکار ہے۔ آپ مجھ سے دور نہ رہئے۔''

شیام صرف چنچلا کو دیکھتا رہا۔ واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ جتنی حسین ہے اس کا دل بھی اتنا ہی سندر ہوگا۔ شیام نے سوچا۔

''تمہارے من میں کیا چل رہا ہے؟''——شیام نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''بتادوں؟''

''ہاں بتاؤنا!''——

''بتادوں؟''

''ہاں بتادو!''

''واقعی بتادوں؟''

''ہاں!''

چنچلا نے بیڈ سوئچ آف کر دیا اور شیام کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ شیام دھیرے دھیرے اس کی طرف جھکتا چلا گیا اور چاند

آہستہ آہستہ بادل میں روپوش ہونے لگا۔

وصل کے بعد دوشیزگی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب چنچلا تیار ہو کر ناشتے کے لئے ڈائننگ ٹیبل کے پاس آئی تو سبھی بھائی اسے ایک ٹک دیکھتے رہے۔

''اتنی سندر.........''

سبھی کے دلوں میں خواہشوں کا چراغ جل اٹھا۔

دوسری رات شیام کچھ بجھا بجھا چنچلا کے کمرہ میں آیا۔چنچلا نے اس کے چہرے کو دیکھا ——

''کیا بات ہے.........آج آپ بجھے بجھے سے لگ رہے ہیں؟ —— چنچلا نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آج میں تمہارے ساتھ نہیں سو سکوں گا'' —— شیام نے یہ جملہ مدھم آواز میں اس طرح ادا کیا جیسے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہوں۔

''تو پھر؟'' —— چنچلا نے زور سے پوچھا۔

''آج رات.........''

''ہاں بولو نا!''

''آج رات.........آج رات.........''

''ہاں بولو نا آج رات.........''

''میری ہمت نہیں ہو رہی ہے۔میری زبان یہ الفاظ ادا کرنے سے نہ جانے کیوں لڑکھڑا رہی ہے۔''

''شیام جو بھی کہنا ہے کہہ دو......... ہاں بولو آج کی رات.........''

''آج کی رات.........بڑے بھیا تمہارے کمرہ میں سو.........سو.........سوئیں گے۔''

''کیا؟''.........تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔اپنی پتنی کو.........''چنچلا تقریباً چیخ پڑی۔

''چنچلا ہمارے پریوار کی یہی پرمپرا ہے۔ایک بھائی شادی کرتا ہے لیکن وہ سبھی بھائیوں کی پتنی ہوتی ہے۔''

''نہیں.........ایسا نہیں ہو سکتا.........میں یہ کام ہرگز نہیں کر سکتی.........میں پانچ بھائیوں کی پتنی بن کر اس گھر میں نہیں رہ سکتی.........میں ابھی اس گھر کو چھوڑ کر جا رہی ہوں.........شادی سے پہلے تم نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا تھا؟''

''اگر بتا دیتا تو آج کے جگ میں کوئی بھی لڑکی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔''

''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں پانچوں بھائیوں کے ساتھ رات گزارنے کے لئے تیار ہو جاؤں گی۔''

''چنچلا تمہیں ایسا کرنا ہی ہوگا'' —— یہ کہہ کر شیام کمرہ سے باہر آ گیا۔چنچلا ایک بے جان مردہ کی طرح دھم سے پلنگ پر گر گئی۔

رات کی سیاہی میں وقت اپنا کھیل کھیلتا رہا اور چنچلا وقت اور حالات کے ہاتھوں چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان پستی رہی۔

ایک رات

دو رات

تین رات

چار رات

اور پانچویں رات پھر شیام اس کے کمرہ میں آیا مگر چنچلا ایک دم ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر بھاگ کر جاتی کہاں سارے راستے بند ہو گئے تھے۔ پیروں میں سماج نے بیڑیاں ڈال دی تھی جسے توڑ پانا ممکن نہیں تھا۔ وہ گھٹ گھٹ کر جی رہی تھی۔ جیسے ناحق اسے جینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی ....وہ زندہ ہی کیوں ہے؟ ....اس نے لڑکی کے روپ میں جنم ہی کیوں لیا؟ ....وہ پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئی .... یا اس کی ماں نے کوکھ میں ہی کیوں نہ مار دیا——— جس طرح آج کل پتا چلتے ہی لڑکی کو کوکھ میں ہی مار دیا جاتا ہے۔ بہت سارے سوال اس کے معصوم ذہن میں ابھرتے اور جواب نہ پا کر اسے پریشان کرتے۔ اب اسے شیام سے وہ محبت نہ رہی تھی بلکہ اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس نے مجھ سے شادی کیوں کیا تھا۔ وہ گھر میں رہتی مگر اس کا ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہتا۔ جس طرح کوکھ میں لڑکیوں کو مارا جا رہا ہے۔ آنے والے وقت میں کیا میری طرح ہی تین، پانچ یا دس مردوں کی بیوی بن کر رہنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

شیام نے شدّت سے محسوس کیا کہ چنچلا اس سے ناراض رہتی ہے۔ ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتی نہ اس کا رویہ اس کے تئیں بہتر ہوتا لیکن شیام چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے پریوار کی پرمپرا کا دھرم نبھا رہا تھا لیکن اس کے دل میں یہ کسک ضرور تھی کہ اس کی بیوی سبھی بھائیوں کی بیوی بن کر جی رہی ہے جب کہ شادی اس کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس لئے چنچلا پر صرف اس کا ادھیکار ہے لیکن اس ادھیکار کو حاصل کرنے کے لئے اسے نہ صرف اپنی پرمپرا کو توڑنا ہوگا بلکہ بغاوت بھی کرنی ہوگی۔ ایک لڑائی لڑنی ہوگی مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے بھائیوں سے بغاوت کے بارے میں سوچ بھی سکے۔

چنچلا اور شیام کا تعلق ہی کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ شیام چنچلا کو کیسے سمجھائے کہ تم میری دھرم پتنی ہو مگر صرف اپنی بیوی کہہ نہیں سکتا کہ تم پانچوں بھائیوں کی بیوی بن گئی ہو ....جو کچھ بھی ہوا اس پہ نہ زور میرا ہے اور نہ تمہارا بلکہ یہ سارا کھیل نصیب کا ہے۔ مقدر کے دائرے میں ہم تم اس طرح الجھ گئے ہیں کہ کسی بھی طرح نکل نہیں سکتے۔ چنچلا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ذرا سی ٹھیس لگتے ہی شیشہ ٹوٹ جاتا ہے——— شیام کی آنکھ سے آنسو چھلک آئے۔

زندگی ایک دائرہ ہی تو ہے۔ زمانہ خود کو دہراتا رہتا ہے۔

چنچلا کو پتہ چلا کہ وہ حاملہ ہے تو اندر تک کانپ گئی۔ روشنی کے چہرے پر تیرگی کے ناخن کے سیکڑوں خراشیں پڑ گئیں۔ وہ اس بچے کو جنم دینا نہیں چاہتی تھی۔ پتہ نہیں کس بھائی کا بچہ ہے۔ اس کی سسکیاں سکوت شب میں سینہ چیر دیتی ہیں۔ وہ رات بھر پریشان رہی آج شام سے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تھا اور کسی بھائی کو اس کے کمرہ میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کوئی اہم فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ شیام کو کسی طرح اپنے فیصلے میں شامل کر لیا اور ڈاکٹر کے پاس جا کر حمل ضائع کروا دیا۔ شیام کو تھوڑی دیر کے لئے افسوس تو ہوا لیکن چنچلا نے اسے سمجھایا——

''شیام میں صرف تمہارے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں .... میرے پیٹ میں کس بھائی کا بچہ پل رہا تھا مجھے خود نہیں معلوم اس لئے کہ کبھی کبھی ایک رات میں تمہارے کئی بھائی میرے پاس آتے تھے۔''

شیام کو بھی شدّت سے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ چنچلا کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ وہ درختوں کے ٹوٹے پتوں کی طرح کچھ دیر تک ہواؤں کے آغوش میں جھولتا رہا۔ وہ چنچلا کی اداسی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ کوئی بھی فیصلہ لینے سے قاصر تھا۔

چنچلا نے جب حمل ضائع کرنے میں شیام کی مدد لی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ شیام کو رام کر سکتی ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ اس نے محبت اور حسن اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔ اسے ہر وقت یہ احساس دلاتی کہ وہ صرف اس کی بیوی بن کر جینا چاہتی ہے۔ مجھے یہ آرام و آرائش نہیں چاہئے میں کٹیا میں رہ کر دال روٹی کھا کر بھی زندگی گزار لوں گی مگر میں یہ اذیت بھری زندگی نہیں جی سکتی۔ تم پڑھے لکھے سمجھدار ہو اس لئے فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم مجھے کیسی زندگی دینا چاہتے ہو۔ یہ اذیت بھری زندگی یا ایک خوش حال زندگی، فیصلہ جلد کرو کیوں کہ میں ہر روز قطرہ قطرہ مر رہی ہوں۔ مجھے قطرہ قطرہ مرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہو یا ایک باوقار زندگی دینا چاہتے ہو۔

شیام تذبذب میں تھا وہ کیا فیصلہ کرے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر چلا جائے یا گھٹن بھری زندگی جینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ وہ کئی راتوں سے سویا نہیں تھا۔ اسے ہر لمحہ چنچلا کی فکر ستاتی رہتی۔ وہ چنچلا کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اتنا بڑا فیصلہ لینے میں اسے دشواری ہو رہی تھی۔ سبھی بھائی اس سے بڑے تھے۔ سارا بزنس، کھیت، روپیہ، پیسہ ان کے قبضے میں تھا وہ آج تک صرف اپنی ضرورت کے لئے ہی پیسے مانگتا لیکن وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔

ایک رات جب چاروں بھائی نیند کے آغوش میں پینگیں لے رہے تھے۔ شیام چنچلا کو لے کر گھر سے باہر آ گیا۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے گھر کو دیکھا مگر چنچلا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چلئے! آج سے ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہیں۔''

دونوں اپنا بریف کیس لئے آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔

●●

ہم سفر

شام نے اپنے گیسو پھیلا دیئے تھے۔سورج آہستہ آہستہ روپوش ہورہا تھااور ہر آدمی جلدی جلدی اپنے گھر پہنچنے کے لئے بس اسٹاپ کی طرف بھاگ رہاتھا۔میں بھی اپنے دفتر سے نکل کر بس اسٹاپ پر آگیااور ایک بینچ پر بیٹھ کر بس کا انتظار کرنے لگا۔مجھے جامعہ نگر جانا تھااور میری بیوی ابھی تک نہیں آئی تھی۔وہ بھی پاس ہی کے دفتر میں نوکری کرتی ہےاس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔میں بس اسٹاپ پر بیٹھا آس پاس کا جائزہ لینے لگا کچھ ہی فاصلے پر بلو رنگ کی جنس اور پنک کلر کی کرتی پہنے ایک لڑکی بیٹھی تھی اس کے بغل میں ایک لڑکا بھی بیٹھا تھا جو لڑکی سے زیادہ ہینڈسم اور اسمارٹ تھا۔دونوں دنیاو مافیہا سے بے نیاز باتوں میں مشغول تھے۔اسی بینچ کے بالکل آخری کنارے پر بڑے پستان والی ایک عورت بیٹھی تھی۔اس کی عمر یہی پینتس سال ہوگی۔اس کے ساتھ دو بچے تھے۔ایک تقریباً آٹھ سال کا اور دوسرا چھ سال کا۔دونوں ماں کے بغل میں خاموش بیٹھے تھے۔بس اسٹاپ پر کئی مرد عورتیں کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہیں۔ایک لڑکی میرے کچھ فاصلے پر کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔وہ موبائل پر بار بار نگاہ کرتی۔شاید کسی کی کال آنے والی تھی۔اس کے چند قدم کی دوری پر ایک ضعیف شخص کھڑا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک تھیلہ تھا۔غالبًا وہ کچھ سامان خرید کر گھر لوٹ رہا تھا۔اس سے ذرا ہٹ کر ایک ادھیڑ عمر عورت بھی بس کے انتظار میں کھڑی سامنے کی سڑک پر آتی بسوں کو تک رہی ہے جب اس کے نمبر کی بس نہیں آتی تو اس کے چہرے پر مایوسی کی لکیریں ابھر آتیں۔

ایک ساتھ کئی بسیں آئیں اور لوگ چڑھنے لگے۔ایک بس پر وہ ضعیف شخص سوار ہو گیا تو دوسری بس پر وہ ادھیڑ عمر عورت۔ بس اسٹاپ پر بھیڑ قدرے کم ہو گئی۔وہ لڑکی جو بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔کسی بھی بس پر سوار نہیں ہوئی یا تو اس کی بس نہیں آئی تھی یا اسے کسی اور کا انتظار تھا۔میرے ساتھ بینچ پر بیٹھے لڑکے لڑکی اور وہ بڑے پستان والی عورت بھی اسی طرح بیٹھی تھی۔لڑکی نے اس لڑکے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔لڑکے نے دوسرا ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیا۔لڑکی مسکرانے لگی۔بڑے پستان والی عورت نے دونوں کو ایک بار دیکھا پھر دوسری طرف منھ پھیر لیا۔اس کے دونوں بچے اب کھڑے ہو گئے۔

''ممی پیشاب کرنا ہے''——بڑے بیٹے نے کہا۔

''ممی مجھے بھی''——— چھوٹے بیٹے نے بھی کہا۔

''پیچھے کرلو''——— بڑے پستان والی عورت نے بیٹھے بیٹھے بس اسٹاپ کے پیچھے اشارہ کیا۔ دونوں پیچھے چلے گئے۔ بس اسٹاپ کے پیچھے ایک چھوٹی سی نالی بہہ رہی تھی۔ نالی کے قریب دیوار تھی۔ دونوں بچے نالی کے کنارے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے لگے۔ چھوٹے والے نے اپنے پیشاب کی دھار بڑے کی دھار سے ملایا۔ بڑا والا بھی ذرا ترچھا ہو کر دھار سے دھار ملانے لگا۔ اب دونوں پیشاب کی دھار کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔

''دیکھتا ہوں کون کاٹتا ہے۔''——— بڑے لڑکے نے کہا۔

''میں کاٹوں گا''——— چھوٹے لڑکے نے کہا۔

لیکن اس کا پیشاب جلد ختم ہو گیا اور دھیرے دھیرے اس کی دھار کم ہو کر رک گئی۔

''میں جیت گیا!''——— بڑے لڑکے نے کہا۔ چھوٹا لڑکا بغیر کچھ کہے ماں کے پاس آ گیا۔ ماں نے بوتل سے پانی انڈیل کر ہاتھ پر دیا۔ اس نے ہاتھ دھولیا۔ بڑے لڑکے نے بھی ہاتھ دھولیا۔

''ممی آئس کریم!''——— چھوٹے لڑکے نے آئس کریم والے کو دیکھ کر کہا۔ آئس کریم والا ابھی ابھی آیا تھا۔ بڑے پستان والی عورت نے پرس سے بیس کے نوٹ نکالے اور بڑے بیٹے کو دیتے ہوئے کہا.........

''دس دس کے دو آئس کریم لے لو''

دونوں بچے آئس کریم والے کے پاس چلے گئے۔ چھوٹا والا پہیئے پر چڑھ کر آئس کریم کے ڈبے کے اندر جھانکنے لگا۔

''مجھے ڈنٹی والا چاہئے''

''مجھے ڈبے والا''

آئس کریم والے نے دونوں کی پسند کی آئس کریم دے دی۔ دونوں ماں کی بغل میں بیٹھ کر کھانے لگے۔

وہ لڑکی جو کافی دیر سے کھڑی بار بار گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ سامنے سے ایک بائیک آ کر بس اسٹاپ پر رُکی۔ وہ جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ بائیک ایک لڑکا چلا رہا تھا اس نے تیزی سے بائیک آگے بڑھائی اور لڑکی اس کی پیٹھ سے چپکتی چلی گئی۔

میرے کچھ فاصلے پر بیٹھے لڑکے لڑکی ایک دوسرے کی انگلیوں سے کھیل رہے تھے اور باتوں میں مشغول تھے۔ جیسے آج پوری رات گزر جائے گی مگر بات ختم نہ ہوگی۔

''آئس کریم کھاؤ گی؟''——— لڑکے نے لڑکی سے پوچھا۔

''ہوں!''——— لڑکی نے چھوٹا سا جواب دیا۔

لڑکا اٹھ کر آئس کریم والے کے پاس گیا۔ پرس سے سو کا نوٹ نکال کر آئس کریم والے کی طرف بڑھایا اور دو مہنگے آئس

کریم لے کر آ گیا۔ ایک لڑکی کو دیا اور دوسرا خود کھانے لگا۔ کھانے کے دوران دونوں خاموش رہے البتہ لڑکی نے اپنا ایک ہاتھ لڑکے کے کندھے پر رکھ دیا پھر اپنا کھایا ہوا آئس کریم اس کے منھ کی طرف بڑھایا۔ لڑکے نے تھوڑا سا کھا لیا۔ لڑکے نے بھی اپنا آئس کریم اس کے منھ کی طرف بڑھایا۔ اس نے اس کا ایک حصہ کھا لیا۔ آئس کریم کھانے کے بعد لڑکی نے پرس سے ہینکی نکال کر ہاتھ صاف کیا پھر لڑکے کی طرف بڑھایا۔ لڑکے نے اپنا ہاتھ صاف کر کے ہینکی واپس کر دیا۔

بس اسٹاپ پر دھیرے دھیرے بھیڑ بڑھنے لگی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ کی ابھی تک میری بیوی نہیں آئی ہے۔ میں نے ایک بار پھر بس اسٹاپ پر کھڑے لوگوں کی طرف دیکھا' ایک بائیک آ کر رکی اس کے پیچھے چہرے کو نقاب سے ڈھکے ایک لڑکی اتری۔ اس نے لڑکے کو بائی کہا۔ لڑکا بھی بائی کہہ کر بائیک کو آگے بڑھا دیا۔ لڑکی بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کرنے لگی۔ اسی درمیان ایک لڑکی اپنا پرس سنبھالتی ہوئی میری بغل میں جو تھوڑی سی جگہ خالی تھی بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف بس ایک بار دیکھا۔ اس ڈر سے نظر ہٹا لیا کہ اگر دیر تک گھور کر دیکھتا رہوں گا تو مجرم قرار پاؤں گا اور کسی لڑکی کو دیر تک دیکھنے کے جرم میں کئی سالوں تک جیل کی دیواروں کو دیکھنا پڑے گا۔

''آپ مجھے گھور رہے تھے!''—— لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''نہیں تو!''—— میں نے بغیر دیکھے کہا۔

''میں کہتی ہوں کہ آپ نے مجھے دیکھا ہے۔''

''صرف ایک بار.........''

''کیوں دیکھا''

''کسی کو بھی دیکھنا انسانی فطرت ہے''

''انسانی نہیں مردانی فطرت ہے''—— آس پاس کے لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔

''آپ جو سمجھ لیجئے''

''لیکن آپ نے مجھے دیکھا کیوں؟''

''یونہی نگاہ اُٹھ گئی.........اگر آپ کو دیکھنا میرا برا لگا تو معافی چاہتا ہوں''

''کمال کرتے ہیں۔ گناہ کر کے معافی مانگتے ہیں۔ اس طرح تو کوئی بھی گناہ کرے گا اور معافی مانگ کر بچ جائے گا''

''ایک بار دیکھنے کے لئے سرکار نے ابھی کوئی قانون نہیں بنایا ہے۔ جب قانون بنے گا تب میں سزا کا مرتکب ہوں گا''

''لیکن میری نظر میں آپ مجرم ہیں۔ اس لئے کہ آپ نے مجھے دیکھا ہے''

''میں نے معافی مانگ لی ہے''

اسی وقت ایک جلوس سڑک سے گزرنے لگا۔ جلوس میں بہت سارے مرد عورت ہاتھوں میں تختی لئے خاموش چل رہے

تھے۔ جیسے ان کے لب کسی نے سی دیئے ہوں۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ تختی پر جو نعرے لکھے ہیں اسے کتنے لوگ پڑھ پائیں گے۔ اگر ہندوستان کا ہر آدمی اس نعرے کو پڑھ لیتا تو ملک میں انقلاب نہ آ جاتا؟

''یہ جلوس کس چیز کے لئے نکلا ہے بابو جی؟''——— میرے تھوڑے فاصلے پر جو ابھی ابھی ایک مزدور آ کر کھڑا ہوا تھا' بغل میں کھڑے آدمی سے پوچھا۔ اس آدمی نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔

''تختی میں سب لکھا ہے' پڑھ لو''——— اس نے جھنجھلا کر کہا۔

وہ مزدور خاموش ہو گیا۔ آئس کریم بیچنے والا بھی حیرت سے جلوس کو گزرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس مانگ کو لے کر جلوس نکالا گیا ہے۔

''دیکھا آپ نے لوگ عورتوں کی حفاظت کے لئے سڑکوں پر اتر آئے ہیں اور آپ یہاں بیٹھے ایک اکیلی لڑکی کو گھور رہے تھے''——— میری بغل میں بیٹھی لڑکی پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ قانون بنانے سے اگر سدھار آ جاتا تو یہ ملک کب کا ترقی یافتہ ملک بن جاتا۔ انسان کو اپنی سوچ بدلنی ہوگی محترمہ۔ اپنا نظریہ بدلنا ہوگا۔ جب ہم گھر سے نکلتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ میرے گھر میں بھی جوان بہن ہے لیکن ہم دوسری لڑکیوں کو دیکھ کر اپنی آنکھیں سینکتے ہیں۔ جب ہم اپنی بہن کے ساتھ سفر کرتے ہیں تو ہرگز نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا مرد اس کی بغل میں بیٹھے لیکن جب ہم اکیلے رہتے ہیں تو لڑکی کی بغل میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی بہن' اپنی بیوی کی عزت کی بڑی فکر ہوتی ہے اور دوسرے کی بہن کی عزت لوٹنے میں پل بھر کے لئے بھی اپنی بہن کا خیال نہیں آتا کہ جب وہ اکیلی باہر نکلے گی تو اس کے ساتھ بھی کوئی ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ جب تک ہم نہیں بدلیں گے ملک نہیں بدلے گا۔''

''تو پھر آپ ہی انقلاب کا پرچم ہاتھوں میں لے کر نکل پڑیئے''——— اس لڑکی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

''انقلاب سوچ میں لانا ہوگا......... اپنی فکر میں لانا ہوگا......... نظریئے میں لانا ہوگا......... ہمیں عورتوں کا احترام کرنا سیکھنا ہوگا......... ہمیں اس کی عزت کا خیال رکھنا ہوگا......... اس کی پاکیزگی کا بھرم رکھنا ہوگا......... تب کوئی قانون بھی کارگر ہوگا۔ ہندوستان میں قانون بنتے ہیں اور توڑے بھی جاتے ہیں یا خریدے جاتے ہیں''

''آپ تقریر بہت اچھی کر لیتے ہیں لیکن جناب بس آ گئی ہے چلئے.........''

اس نے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا' ہم دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور بس میں سوار ہو گئے۔

●●

یہ زندگی

علینا نے جب نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تو حسب معمول اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔آنسو رخساروں سے ڈھل کر دوپٹے میں جذب ہونے لگے۔جیسے تپتے ریگستان میں پانی کے قطرے گر کر خشک ہو جاتے ہیں۔علینا کی زندگی صحرا ہی کی طرح تو تھی۔ جہاں دور دور تک ریگزار تھے۔بگولے اڑ رہے تھے۔جس میں اس کا وجود سورج کی تپش اور ریت کی گرمی سے گرم آلود ہو گیا تھا۔اس کی زندگی میں شبنمی سحر کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔علینا کے لب خاموش تھے لیکن دل سے بار بار یہی دعا نکل رہی تھی۔

''اے ربّ العزت ....میرے شوہر بے قصور ہیں.........انہیں ناحق پھنسایا گیا ہے۔ پانچ سال سے جیل کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ان کی رہائی کی کوئی سبیل نکال دے تاکہ میری اجاڑ' بے رنگ زندگی میں پھر سے بہار آجائے۔خزاں کا موسم گزر جائے اور بادصبا کا حسین جھونکا پھر سے میری زندگی میں جھوم جھوم کر آجائے.........تو رحیم و کریم ہے.........مشکل سے نکالنے والا ہے.........میرے شوہر کو بھی مشکل سے نکال دے''

علینا جب نماز سے فارغ ہو کر اپنے کمرہ میں آئی تو عاقل سو چکا تھا۔کائنات ابھی تک جاگ رہی تھی۔وہ اپنی کورس کی کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔علینا اس کے پاس آ گئی۔

''بیٹی آپ ابھی تک سوئیں نہیں؟''——علینا وہیں بستر پر بیٹھ گئی۔

''جی امّی تھوڑا سا ہوم ورک باقی رہ گیا تھا۔اسے پورا کر رہی ہوں''—— کائنات نے ماں کو دیکھے بغیر ہی کہا اور اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔علینا نے چادر اٹھا کر عاقل کے بدن پر ڈالی اور اس کے بغل میں لیٹ گئی۔اس کا ذہن پھر سے سہیل کی یادوں میں بھٹکنے لگا۔

سہیل ایک کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز تھا۔علینا پری پی ایچ۔ڈی ٹیسٹ کا امتحان دے رہی تھی۔ امتحان کا سنٹر اسی کالج میں تھا۔وہ اپنا پیپر لکھ رہی تھی۔سہیل گارڈنگ کر رہا تھا۔وہ گھومتا ہوا اس کے پاس کچھ پل کے لئے کھڑا ہو گیا۔علینا معروضی سوال حل کر رہی تھی۔سوال تھا اس میں کون سا ناول پریم چند کا نہیں ہے۔علینا نے جواب غلط لکھا تھا۔علینا نے

نظر اٹھا کر سہیل کی طرف دیکھا۔ سہیل اسے بتانا چاہتا تھا کہ تمہارا جواب غلط ہے لیکن صرف مسکرا کر رہ گیا۔ علینا نے اس کی مسکراہٹ کو دیکھ لیا۔ اسے شک ہونے لگا کہ شاید اس کا جواب غلط ہے۔ اس نے سوال کو پھر سے پڑھا لیکن اس کے ذہن نے کہا جواب صحیح ہے اور آگے بڑھ گئی۔

علینا جب کاپی جمع کرنے سہیل کے پاس گئی تو اس نے پوچھا—— ''آپ میرے جواب لکھنے پر مسکرا رہے تھے۔ کیا میں جان سکتی ہوں، کیوں مسکرا رہے تھے؟——

''پندرہ نمبر کا جواب آپ کا غلط تھا۔ سوال تھا کہ ان میں سے کون سا ناول پریم چند کا نہیں ہے۔ آپ نے جواب میں پریم چند کے ناول کا ہی نام لکھ دیا۔ جب کہ اس کا جواب ''شکست'' ہونا چاہئے تھا جو کرشن چندر کا ناول ہے۔''

علینا خاموش ہوگئی اور اسی طرح کھڑی رہی۔ سہیل کاپی لیتا رہا پھر سب کو ارینج کیا مگر علینا اسی طرح کھڑی رہی۔ سہیل نے علینا کی طرف دیکھا۔

''جی کہئے.........کچھ کہنا چاہتی ہیں؟''

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں.........''

سہیل نے اپنی جیب سے ویزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا—— ''آپ شام پانچ بجے کے بعد آسکتی ہیں میں گھر پر مل جاؤں گا''

علینا سہیل سے مل کر بے حد مرعوب ہوئی۔ ملاقات کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور شادی کی حد تک پہنچ گیا۔ علینا سہیل کی بیوی بن کر اس کے گھر میں آگئی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد محبت کرتے تھے۔ علینا نے پی ایچ۔ڈی کر لی تھی اور نوکری کے لئے کوشاں تھی۔ اس کے دو بچے تھے عاقل اور کائنات۔ کائنات بڑی تھی۔ دس سال کی کائنات اور آٹھ سال کا عاقل ۔ بہت اچھی زندگی گزر رہی تھی کہ ایک طوفان نے اس کی زندگی کو متزلزل کر دیا۔

ایک رات پولس کی ایک ٹیم اس کے گھر آئی اور سہیل کو گرفتار کر کے لے گئی۔ اس نے صرف اتنا بتایا کہ سہیل کا تعلق انڈین مجاہدین سے ہے۔ علینا کانپ گئی اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ سہیل کا تعلق اس طرح کی تنظیم سے بھی ہے وہ بہت کم گو تھا۔ کالج سے سیدھا گھر آتا اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وقت گزارتا۔ اس کے گھر بھی لوگوں کا آنا جانا بہت کم ہوتا تھا یا تو طالب علم آتے تھے یا ان کے لکچرار دوست.........پھر یہ الزام.........علینا پریشان ہوگئی۔ اس نے کافی بھاگ دوڑ کی لیکن سہیل چھوٹ نہ سکا۔ تھک ہار کر بیٹھ گئی۔

جب گھر کی معاشی حالت بگڑنے لگی تو اس نے ایک پرائیوٹ اسکول میں نوکری اختیار کر لی اور کسی طرح گھر کی حالت کو سدھارا۔ بچوں کی فیس، کتاب، یونیفارم.........اس نے ہمت نہیں ہاری اور ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرنے لگی لیکن جب کبھی ٹوٹ جاتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور آج بھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ کائنات نے ماں کو روتے ہوئے

دیکھا تو بول اٹھی۔

''امی نہ روئیے.........میرے ابو بے قصور ہیں.........وہ ایک دن ضرور چھوٹ جائیں گے''

علینا تڑپ کر کائنات کو سینے سے چمٹا لیتی.........''بیٹی خدا نے آپ کے اندر کتنا صبر دے دیا ہے''——— کائنات بھی رو پڑی۔

''امّی اسکول میں لڑکے لڑکیاں مجھے حقارت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ زبان سے کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن ایسا لگتا ہے وہ سب بول رہے ہیں' اس کا باپ دہشت گرد ہے۔ ٹیچر کا بھی رویہ بہتر نہیں ہوتا جیسے میں ہی گنہگار ہوں۔ میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ اسکول چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں ان کی ذلت بھری نگاہوں کا سامنا نہ کروں''

''نہیں بیٹی نہیں ....کسی بھی حال میں اسکول نہیں چھوڑنا ہے۔ پڑھائی ترک نہیں کرنی ہے.........وہ لوگ یہی تو چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کا کیریر تباہ ہو جائے اور یہ احساس اتنا شدید ہو جائے کہ زندگی میں کچھ نہ کر سکیں.........آپ کو ابھی بہت دور جانا ہے' کچھ بن کر دکھانا ہے۔ صرف اپنے دل میں اس خیال کو مضبوط کر لیجئے کہ آپ کے ابو بے قصور ہیں باقی سب خدا پر چھوڑ دیجئے''

''امی میں جانتی ہوں۔ ابو بے قصور ہیں اور وہ ایک دن ضرور رہا ہوں گے''

''بیٹی خدا کرے ایسا ہی ہو.........چلئے اب سو جایئے رات کافی ہو گئی ہے''

کائنات بستر پر دراز ہو گئی مگر علینا جاگ رہی تھی کہ جاگنا ہی اس کا مقدر ہو گیا تھا۔ بستر اسے کانٹے چبھوتا سہیل کی موجودگی کا احساس اسے ہر وقت ستاتا رہتا جیسے وہ بالکل اس کے پاس کھڑا ہے۔ ذہن کی تتلی اپنے پروں پر بے رنگی کا رنگ چڑھائے سہیل کی یاد کی کیاریوں میں مرجھائے پھولوں پر رس کی خواہش میں اڑتی پھر رہی ہے۔ خاموشی علینا پر چیخ رہی ہے۔ درد کی برف نہ جانے کب پگھلے گی' کب تک یہ ہجر زدہ رات میرے سرہانے بیٹھی رہے گی.........ممکن ہے سہیل آپ واپس آ جائیں اپنے اس گھر میں.........میرا دل چاہتا ہے سنہری دھوپ میں ہم بیٹھ کر پھر سے باتیں کریں' لیکن نہ جانے میری یہ آرزو کب پوری ہوگی.........سہیل آپ کو کیا بتائیں کہ جب سے آپ گئے ہیں یہاں چاندنی راتیں نہیں ہوتیں.........شب و روز تو وہی ہے' معمول وہی ہے.........مگر ایک ویرانی سب پر ٹپکتی ہے.........

علینا کی آنکھوں کا کونا بھیگ گیا۔ وہ اس طرح ٹوٹ گئی تھی جیسے ماں کی ممتا کے بغیر بچے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس کے سارے خواب آنکھوں میں قتل ہو گئے تھے.........اس کی ہر خواہش رات کی صورت مٹ گئی تھی۔ اس کی زندگی اس کے چہرے پر ہر روز ایک سوال لکھ رہی تھی———

''سہیل بے قصور ہیں تو وہ کب رہا ہوں گے یا ساری زندگی جیل کی سلاخوں.........نہیں نہیں.........ایسا نہیں ہو سکتا.........میرا دل کہتا ہے وہ ایک دن ضرور رہا ہوں گے اور میری زندگی پھر سے سبز و شاداب ہو جائے گی''———علینا کے دل میں

ایک کرن پھوٹتی اور وہ کروٹ لے کر سونے کی کوشش کرنے لگتی۔

باہر آسمان صاف تھا لیکن علینا کی آنکھوں میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ آج کچھ پہلے ہی جاگ گئی تھی جلدی جلدی تیار کر کے بچوں کو اسکول بھیج دیا اور کورٹ جانے کے لئے تیار ہو کر سڑک پر آ گئی۔ وہ اپنی جنگ تنہا لڑ رہی تھی اس کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ سارے رشتے داروں نے منہ موڑ لیا تھا کہ اگر سہیل کا ساتھ دیا تو کہیں شک کے بنیاد پر اسے بھی دہشت گرد کہہ کر جیل میں نہ ڈال دیا جائے۔

علینا جب کورٹ پہنچی اس کا دل لرز رہا تھا۔ پتہ نہیں آج کیا فیصلہ آنے والا ہے؟—— کیا میری زندگی میں بہار آئے گی یا پوری زندگی ویران صحرا میں ہی گزر جائے گی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی آج وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ کب جج اپنی کرسی پر آئے اور اپنا فیصلہ سنا دے۔ وہ اندر سے کانپ رہی تھی۔ نہ جانے کیا ہوگا؟.........اور جب جج کا فیصلہ آیا تو علینا کی خوف زدہ آنکھیں کھل گئیں.........زندگی سے جنگ پر آمادہ آنکھیں مسکرائیں۔ وہ اچانک کھڑی ہوگئی۔ اس کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی—— سہیل کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اسے رہا کر دیا گیا۔

علینا عدالت سے باہر آ گئی۔ باہر آ کر وہ اس طرح مسکرائی جیسے اندھیرے میں سو چراغ جھلملانے لگے ہوں۔

ضروری کاروائی کے بعد جب سہیل علینا کے سامنے آیا اس کے وجود کا ہر انگ پسینے کی بوندوں کی طرح سردی بھری فضا میں بھی تھرتھرا رہا تھا۔ وہ کچھ لمحہ خاموش رہا' کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ علینا ہی نے بڑھ کر سہیل کا ہاتھ تھام لیا اور گھر کی طرف آہستہ قدموں سے بڑھنے لگی۔

عاقل اور کائنات اسکول سے آ گئے تھے جب ان کی نظر اپنے ابو پر پڑی دوڑ کر لپٹ گئے۔ عاقل تو زار و قطار رونے لگا لیکن کائنات صرف سسکیاں بھر رہی تھی۔ سہیل بھی رو پڑا۔ علینا نے دونوں بچوں کو الگ کیا۔ دونوں کے آنسو پوچھے اور آگے بڑھ گئی۔

سہیل کی زندگی پھر سے معمول پر آ گئی تھی۔ نوکری بھی بحال ہوگئی تھی۔

پیاری پیاری سبز روشنی اندھیری رات میں بہت بھلی معلوم ہوئی۔ سہیل جلد ہی سو گیا تھا۔ عاقل بھی سو گیا تھا مگر علینا اور کائنات جاگ رہی تھیں۔ علینا نے کائنات کی طرف دیکھا——

''بیٹی اب سو جایئے' خدا کے فضل و کرم سے آپ کے ابو بے قصور ثابت ہوئے اور سب کچھ معمول پر آ گیا۔''

کائنات نے ماں کے چہرے کو دیکھا اور کہا—— ''نہیں امی.........میں سوچ رہی ہوں کہ ابو تو باعزت رہا ہو گئے لیکن ہم لوگوں نے پانچ سال جن اذیتوں میں گزارے ہیں اسے کون واپس کرے گا؟''

●●

شدّھی کرن

بوڑھے شجر پر صبح کی کرنیں جب پڑتیں' کرشنا چودھری کی آنکھوں میں ایک نئی چمک نمودار ہو جاتی۔اسکی پلکوں پہ خوشی کے تارے جھلملانے لگتے۔ایک خواب تھا جو برسوں سے اسکی آنکھیں دیکھتی آ رہی تھیں۔خواب پہلے پہل دھندلا سا نظر آتا تھا لیکن جیسے جیسے اسکا بیٹا وکاس چودھری اپنی کلاس میں پڑھائی میں سبھی بچوں کو پیچھے چھوڑتا گیا اور ہمیشہ اوّل پوزیشن کو برقرار رکھا' کرشنا چودھری کے خواب کی بنیادیں پختہ ہوتی گئیں۔لیکن اسکا گھر——؟ نہ پختہ دیواریں نہ پختہ چھت۔صرف کچی دیواریں' جس پر بانس اور پھوس کے اوپر چھپر ڈال دیئے گئے تھے۔اسکا آبائی پیشہ تاڑ سے تاڑی اتار کر فروخت کرنا تھا لیکن کرشنا چودھری نے یہ پیشہ ترک کر دیا تھا وہ ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر ہو گیا تھا وہ چاہتا تھا اب اسکا بیٹا وکاس چودھری اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بلند مقام تک پہنچے۔

دن ڈھلتا ہے تو رات آتی ہے جو تمام چھوٹے بڑے' کھرے کھوٹے' سچے جھوٹے انسانوں پر آرام کی' سکون کی چادر تان دیتی ہے جس میں انسان کچھ پل' کچھ لمحے' کچھ گھنٹے کے لئے اپنا سب کچھ بھول جاتا ہے اور رات کی تنی ہوئی چادر میں اپنے وجود کو اس طرح سمیٹ لیتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب صبح نمودار ہو گئی۔صبح ہوتے ہی خلقت بیدار ہوتی ہے۔کرشنا چودھری نے جب آنکھ کھولی تو آج کا اخبار اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اپنے بیٹے وکاس چودھری کا رزلٹ دیکھا اس نے اوّل پوزیشن سے دسویں کا امتحان پاس کیا تھا۔اس نے اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا۔

''بیٹے آج تم نے پہلی منزل طے کر لی ہے اگر اسی طرح آگے بڑھتے رہے تو میرا برسوں کا خواب پورا ہو جائے گا''—— کرشنا چودھری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے——''چل بیٹا مکھیا جی سے آشیرواد لے لے' گاؤں کے بزرگ آدمی ہیں۔''

گاؤں کا مکھیا ہریندر سنگھ آرام کرسی پر بیٹھا موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ایک حواری ان کا پیر دبا رہا تھا۔کئی لوگ ان کے اردگرد بیٹھے تھے۔کرشنا چودھری اور وکاس ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے۔جب بات ختم ہو گئی تو ہریندر سنگھ نے دونوں کی طرف دیکھا——

''کہو کرشنا چودھری کیسے ہو؟''

''بھگوان کی کرپا ہے؟''

''تمہارا بیٹا تو اب بڑا ہو گیا ہے کہیں کام وام پر لگایا یا نہیں؟''——— ہریندر سنگھ نے وکاس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں مکھیا جی وکاس تو ابھی پڑھے گا۔ دسویں کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا ہے۔ اس لئے آپ کے پاس آشیرواد کے لئے لایا ہوں۔ آپ اسے آشیرواد دیجئے کہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن سکے———'' کرشنا چودھری کے چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی۔

ہریندر سنگھ نے حقارت بھری نگاہ دونوں باپ بیٹے پر ڈالی پھر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی سرکار نے تم لوگوں کو ریزرویشن دے رکھا ہے کہیں نہ کہیں تو لگ ہی جائے گا۔ جیسے ریزرویشن کا فائدہ اٹھا کر تم ٹیچر بن گئے میرا آشیرواد اسکے ساتھ ہے——— ہریندر سنگھ نے دور سے ہی ہاتھ اُٹھا کر آشیرواد دیا۔ وکاس کو بہت برا لگا کہ وہ پاس بلا کر سر پر ہاتھ رکھ کر بھی آشیرواد دے سکتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کسمسا کر رہ گیا۔ کرشنا چودھری کو بھی برا لگا وہ وکاس کو لے کر حویلی سے باہر آ گیا۔ ان کے جانے کے بعد ہریندر سنگھ نے زور سے قہقہہ لگا کر پاس بیٹھے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''کرشنا چودھری لاکھ ٹیچر بن جائے لیکن اُسکی آج بھی ہمت نہیں ہے کہ میرے سامنے بیٹھ سکے۔ آج بھی اُسی طرح کھڑا رہتا ہے۔ جس طرح اسکا باپ میرے پتا جی کے وقت میں کھڑا رہتا تھا۔ میں نے بھی اُسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ نیچ ذات کا ہو کر میرے سامنے بیٹھے، میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا وہ تو سرکار نے چھوٹ دے رکھی ہے نہیں تو حویلی کے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ بڑا آیا بیٹا کو آفیسر بنانے والا جیسے ڈی۔ ایم۔، ایس۔ پی۔ بن جائے گا ارے بہت ہوگا تو کہیں کسی دفتر میں کلرک وغیرہ بن جائے گا..... ہاہاہا.....''

کرشنا چودھری اور وکاس کے کانوں میں ہریندر سنگھ کی باتیں اس طرح سنائی دیں جیسے کسی نے پگھلا ہوا شیشہ کانوں میں ڈال دیا ہو۔ وکاس تلملا کر رہ گیا۔ اسکے دل میں آیا کہ لوٹ کر حویلی جائے اور ہریندر سنگھ کا کالر پکڑ کر اُٹھائے اور بولے———

''ہریندر سنگھ تم ہم پر ہنس رہے ہو ایک دن ایس۔ پی۔ بن کر دکھاؤں گا''——— لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ کرشنا چودھری کے اندر بھی غصے کی ایک چنگاری اُبھری مگر جلد شانت ہو گئی۔

راستے میں گزرتے ہوئے گاؤں کا اکلوتا مندر ملا۔ کرشنا چودھری نے دور سے ہی بھگوان کو جھک کر ماتھا ٹیکا۔ وکاس چاہتا تھا کہ وہ اندر جا کر بھگوان کے چرن چھوئے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا پنڈت جو دروازے پر کھڑا تھا اس نے حقارت کی نگاہوں سے باپ بیٹے کو دیکھا۔ وکاس کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ آٹھ سال کا تھا اور اپنے ہم جماعت بچوں کے ساتھ مندر کی سیڑھیوں پر کھیل رہا تھا تو اسی پجاری کے کہنے پر نہ صرف اسے اور اسکے دوستوں کو پیٹا گیا تھا بلکہ اس بات کو لے اس کے والدین اور برادری کے کئی لوگوں کو زدوکوب کیا گیا تھا۔ دونوں باپ بیٹا چلتے چلتے ندی کنارے آ گئے۔ ندی کے آس پاس کوئی نہ تھا وہ دونوں ایک پتھر پر بیٹھ

گئے۔

''بیٹا ہم کتنے بدنصیب ہیں کہ مندر میں جا کر دو پھول نہیں چڑھا سکتے۔ بھگوان کے چرن نہیں چھو سکتے۔ تجھے بھگوان کا آشیرواد نہیں دلا سکتے'' —— آنکھوں میں ٹھہرا ہوا درد پگھلتا ہے اور نمی بن کر کنارے پر ٹھہر جاتا ہے۔

''پتا جی اب زمانہ بدل رہا ہے' تھوڑا اور انتظار کیجئے بہت جلد سب کچھ بدل جائیگا۔ سکچھا آ جانے کے بعد یہ بھید بھاؤ خود بخود ختم ہو جائیگا۔''

''ہاں بیٹے مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔ اب تجھے آگے پڑھائی کے لئے شہر جانا ہے۔ میں نے سارا انتظام کر دیا ہے۔ تو صرف میرا نہیں بلکہ پوری برادری کا نام روشن کر کے دکھائے گا۔''

''پتا جی آپ کا سپنا ضرور پورا ہوگا۔ چلئے گھر چلتے ہیں۔''

آج پندرا گست تھا اسکول میں جھنڈا تولن ہونا تھا۔ گاؤں کے مکھیا ابھی تک نہیں آئے تھے۔ کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی نہیں آئے تو وہاں موجود لوگوں نے کرشنا چودھری سے کہا ——

''آپ ہی جھنڈا تولن کر دیجئے۔ آپ اس اسکول کے سب سے سینئر ٹیچر ہیں۔''

''مکھیا جی کا تھوڑا اور انتظار کرنا چاہیئے۔'' —— اس نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

دس تو بج گئے آٹھ بجے کا سمے دیا تھا لگتا ہے مکھیا جی کسی دوسرے کام میں مصروف ہیں۔'' —— ایک ٹیچر نے کہا۔

''ماسٹر صاحب اب مزید انتظار نہ کیجئے آپ جھنڈا تولن کیجئے۔'' —— گاؤں کے ایک ضعیف نے زور دے کر کہا۔

کرشنا چودھری کچھ پل رکے پھر کچھ ہچکچاہٹ کے بعد آگے بڑھے ابھی وہ رسی پکڑ کر کھینچنے ہی والے تھے کہ ہریندر سنگھ کی گرج دار آواز اسکے کانوں سے ٹکرائی ——

''کرشنا چودھری ٹھہر جاؤ'' —— وہ رک گیا۔ ہریندر سنگھ اسکے قریب آ گئے اور حقارت بھری نظروں سے کرشنا چودھری کو دیکھا۔

''جھنڈا تولن کے لئے آگے بڑھنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟''

''آپ نہیں آئے اور لوگوں نے اصرار کیا تو میں آگے بڑھ گیا۔''

''تمہاری اوقات نہیں ہے جھنڈا تولن کرنے کی' آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ ہماری برادری کا ایک بچہ جھنڈا تولن کر سکتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے'' —— ہریندر سنگھ کی آنکھوں میں غصّہ کی جوالا بھڑک رہی تھی۔

کرشنا چودھری تلملا کر رہ گیا مگر خاموش رہا اُسے ایسا لگا کوئی اس پر بہت سارے پتھر برسا رہا ہے اور اسکا وجود لہولہان ہو کر زمین پر پڑا سسک رہا ہے۔

وقت ہر زخم بھر دیتا ہے لیکن جب بھی پندرا گست یا 26 جنوری آتا کرشنا چودھری کا زخم ہرا ہو جاتا۔ لیکن وہ وقت کا انتظار

کررہا تھا کہ وقت ایسا طمانچہ مارتا ہے جس کا احساس انسان برسوں کرتا ہے اور ایسا ہی طمانچہ ہریندر سنگھ کو پڑا تھا۔ وکاس چودھری نے U.P.S.C. کا کمپیٹیشن نکال لیا تھا اور ایس۔ پی۔ کی ٹریننگ لینے کے بعد اس کی پوسٹنگ ہوگئی۔ کرشنا چودھری کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ گاؤں میں مٹھائیاں بانٹ رہا تھا مگر ہریندر سنگھ کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

وکاس اپنے چیمبر میں بیٹھا فائل پڑھ رہا تھا کہ اسکے پی۔ اے۔ نے بتایا کہ کوئی پنڈت جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

''بھیج دو'' ——— وکاس نے فائل پر دستخط کر کے دوسری طرف رکھا اور نظر اٹھا کر دیکھا ایک ادھیڑ عمر کا پنڈت چیمبر میں داخل ہوا۔

''آیوسمان بھوہ بالک.....''

''پنڈت جی کہئے کیا کام ہے؟''

وکاس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی' جس آشیرواد اور پرساد کے لئے برسوں ترستا رہا آج خود سے چل کر پنڈت جی اسکے چیمبر میں کھڑے تھے وہ اٹھا پنڈت جی کے پیر چھوئے' پنڈت جی نے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سدا خوش رہو۔''

وکاس جب آشیرواد لے کر کھڑا ہوا تو پنڈت جی نے اسکے ماتھے پر تلک لگایا اور تھالی سے پرساد اٹھا کر وکاس کی طرف بڑھایا وکاس نے دونوں ہاتھوں کو کٹورا بنا کر پرساد لے کر منہ میں ڈالا اور سر پر ہاتھ پھیر لیا۔ اپنے پرس سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر پنڈت جی کی تھالی میں رکھ دیا۔ پنڈت جی کا چہرہ کھل اُٹھا اور مزید آشیرواد دیتے ہوئے چیمبر سے باہر نکل گئے۔ پنڈت جی کے جانے کے بعد جیسے ہی اپنی کرسی پر بیٹھا موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی اس نے موبائل اُٹھایا اسکے پتا جی کا فون تھا۔

''ہاں پتا جی بولئے سب کُشل منگل تو ہے۔''

''بیٹا سب ٹھیک ٹھاک ہے جیسا کہ تم جانتے ہو کہ گاؤں کا پرانا مندر کو توڑ کر نیا بنایا گیا ہے جس میں تم نے کافی سہیوگ کیا ہے اب وہ مندر بن کر تیار ہو گیا ہے۔ 15 اکتوبر کو پوجا ارچنا کی جائیگی گاؤں کے لوگ چاہتے ہیں کہ مندر کا پٹ تمہارے ہاتھوں کھولا جائے تم ضرور آجانا مکھیا جی بھی یہی چاہتے ہیں۔''

''جی پتا جی ضرور آجاؤں گا آپ اطمینان رکھیں۔''

وکاس جب گاؤں پہنچا تو گاؤں کے لوگوں نے بڑے پُر تپاک انداز سے اس کا سواگت کیا۔ اس نے مندر کا ادگھاٹن کیا۔ پوجا ارچنا کی۔ مکھیا ہریندر سنگھ زبردستی اسے اپنے گھر لے گئے۔ کرسی پر بٹھا کر اپنے بیٹے سریندر کو بلایا۔

''وکاس بیٹے یہ میرا بیٹا سریندر سنگھ ہے۔ ٹھیکیداری کا کام شروع کیا ہے۔ دس لاکھ کا ایک ٹھیکے کا ٹنڈر بھرا ہے جو ڈی۔ ایم۔ صاحب کے ہاتھ میں ہے اگر تم پیروی کر دو تو ٹنڈر اسے مل جائیگا آخر تم پر ہمارا بھی تو کوئی حق ہے۔

''کیوں نہیں۔ سریندر تم سارا ڈیٹیل لے کر میرے آفس آجانا میں ڈی۔ ایم۔ صاحب سے بات کروں گا۔''

''بیٹے بڑا احسان ہوگا میں ابھ تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں'' ـــــــ ہریندر سنگھ ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔

''آپ ہاتھ نہ جوڑیئے میرے پتا سمان ہیں میں یہ کام ضرور کردوں گا۔''

''لو بیٹھو چائے تو پیو۔ یہ بسکٹ لونا شہر سے آج ہی تمہارے لئے منگویا ہے'' ـــــــ ہریندر سنگھ نے ناشتے کی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ وکاس نے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈالا اور چائے کی پیالی اُٹھالی۔ چائے پینے کے بعد وکاس کھڑا ہو گیا۔

''اچھا انکل اب چلتا ہوں۔''

''آج تو گاؤں میں رہو گے نا؟''

''نہیں انکل وہاں بہت کام ہے بس ماں پتا جی سے ملتا ہوا چلا جاؤں گا۔''

وکاس کی جیپ جب تیزی سے آگے بڑھ گئی تو ہریندر سنگھ نے حقارت بھری نظروں سے جاتے ہوئے وکاس کو دیکھا۔

''ایک ہریجن سے کام لینے کے لئے گھر پر بلانا پڑا اور اپنے سامنے بٹھانا پڑا..... ہریا..... ارے ہریا.....''

''جی مالک۔''

''یہ کپ اور ناشتہ کا سارا پلیٹ باہر جا کر پھینک دے اور اس کرسی کو صابن سے بڑھیا سے دھو کر لے آ۔''

''جی مالک ابھی دھوتا ہوں۔'' ـــــــ ہریا ناشتہ کا پلیٹ اور کپ سمیٹ کر باہر پھینک دیتا ہے اور کرسی کو دھونے کے لئے باغ کی دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

وکاس کی جیپ اب گاؤں سے باہر نکل رہی تھی اس نے مندر کے کلش کو دیکھا جو دور سے چمک رہا تھا وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ آج اس نے مندر کا اُدگھاٹن کیا مندر کے اندر پوجا ارچنا کی لیکن اسے کیا پتہ کہ اس کے جانے کے بعد مندر کی دُھلائی شروع ہو گئی تھی۔ گاؤں کا ایک آدمی جو پنڈت جی کے ساتھ مندر کی دھلائی کر رہا تھا پوچھا۔

''پنڈت جی یہ مندر کی دُھلائی کیوں کر رہے ہیں ابھی تو پوجا ہوئی ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گے مندر کا سدّھی کرن کر رہا ہوں۔''

●●

ہَوا اشکار

اس لڑکی کو میں نے ایک دن کے لئے خریدا تھا۔ پورے چوبیس گھنٹے کے لئے۔ وہ بے حد حسین تھی، اتنی حسین کہ کوئی ایک بار دیکھ لے تو اس کے اندر اسے پانے کی خواہش جاگ اٹھے۔ جب وہ میرے سامنے آئی تو کچھ دیر کے لئے میں حیرت میں پڑ گیا۔ اتنی حسین لڑکی اور اس پیشے میں؟ اسے تو کوئی بھی راج کمار بیاہ کر لے جاتا۔

میں اسے لے کر ایک ہوٹل کے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت میں شاید زمین پر نہیں تھا۔ آسمان پر بھی نہیں تھا۔ پتہ نہیں اس وقت میرے پاؤں کہاں تھے، میرا وجود کہاں تھا۔ نہیں نہیں........ میرا وجود تو کمرے میں ہی تھا لیکن میں آسمان میں اُڑ رہا ہوں۔ میرا ذہن دور خلاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔ میں صرف اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے مجھے خاموش کھڑا دیکھا تو خود اپنے کپڑے اتارنے لگی۔ میں نے اسے منع کیا——

''نہیں، کپڑے نہ اتاروں.........''

''کیوں؟.........تم نے مجھے خریدا ہے......... پورے چوبیس گھنٹے کے لئے.........اچھی خاصی رقم دے کر۔ اس لئے تم جس طرح چاہو میرا استعمال کر سکتے ہو.........میں تمہاری زر خرید غلام ہوں مسٹر.........نہیں میں اپنے گاہکوں کا نام نہیں پوچھتی اور نام جان کر بھی کیا کروں گی۔ چوبیس گھنٹے کے بعد تمہارا راستہ الگ ہوگا اور میری منزل کہیں اور.........''

اس کی باتیں مجھے حیرت میں ڈال رہی تھیں۔ میں بھونچکا اسے دیکھ رہا تھا کچھ بول ہی نہ سکا۔ یہ لڑکی کیا ہے؟

''تم مریم ہو——'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ چونکی.........''ہاں تم مریم ہو.........معجزاتی طور پر تم حاملہ ہو گئی تھی لیکن لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں تھے کہ بغیر باپ کے بھی کوئی عورت ماں بن سکتی ہے؟ تمہیں کتنی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن تم سچی تھیں.........بالکل سچی.........جس طرح خدا سچا ہے.........''

اس نے زور سے قہقہہ لگایا—— ہاہاہا.........میں اور مریم.........تم بڑی عجیب باتیں کرتے ہو، پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو لیکن تم اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہو اگر بولو تو اپنے کپڑے اتاروں۔ میرا جسم بے حد خوبصورت ہے۔ ایک بار دیکھ لو تو اس میں ڈوبتے چلے جاؤ گے.........''

''نہیں تم صرف خاموشی سے میرے سامنے بیٹھی رہو۔''

وہ پیچ وتاب کھاتی رہی، کبھی ہنستی کبھی ہلکے سے مسکرا کر رہ جاتی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتی جیسے میں اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اندر ہی اندر اس کے اندر کچھ غصے کا بادل سا چھانے لگا تھا۔ غصہ اور تعجب کے دوراہے پر کھڑی وہ مجھے خواب اور حقیقت کی ایک ایسی دلآویز تصویر نظر آئی جو کبھی تو واضح نظر آتی کبھی دھندلی ہوتی ہوئی صرف ایک عکس میں تبدیل ہو جاتی۔

''تم زلیخا ہو.........تم نے ہی حضرت یوسف سے عشق ....نہیں نہیں، وہ عشق نہیں تھا۔ وہ بوالہوسی تھی۔ کیونکہ حضرت یوسف تم سے محبت نہیں کرتے تھے۔ وہ غلام تھے اور غلام اپنے مالک کی بیوی سے محبت کیسے کر سکتا تھا؟ وہ تم سے فرار حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن تم نے ہی پیچھے سے ان کا دامن پکڑ لیا تھا اور ان کا دامن چاک ہو گیا تھا۔ تم یوسف کے حسن کی دیوانی تھی کہ تمہیں کچھ اور نظر نہیں آ رہا تھا۔''

اس نے پھر قہقہہ لگایا——— تم مجھے کیا کیا بنا دو گے.........میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ میں ایک عام لڑکی ہوں روپیوں کے لئے اپنا جسم بیچتی ہوں اور اس وقت تم میرے خریدار ہو.........اکثر لوگ جب پہلی بار مجھ سے ملتے ہیں۔ میرے حالات جاننا چاہتے ہیں لیکن میں اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاتی۔ اس دھندے کی اکثر لڑکیاں اپنی درد بھری کہانی سنا کر گاہک کو مرعوب کرتی ہیں اور زیادہ سے زیادہ روپئے اینٹھتی ہیں، کوئی کہتی ہے میرا محبوب مجھے دھوکہ دے کر یہاں تک پہنچا دیا، کوئی کہتی ہے میرا شوہر مجھے چھوڑ کر چلا گیا، کوئی اپنی غریبی، اپنی مفلسی کا رونا روتی ہے.........لیکن میں.........''

وہ اچانک کھڑی ہو گئی جیسے اسے کچھ یاد آ رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ سامنے کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی کچھ دیر تک چپ چاپ باہر نظریں جمائے سڑک پر چلتے پھرتے مناظر کو دیکھتی رہی پھر واپس آ کر میرے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی خوشبو فضا کو معطر کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا——— ''سردی بہت ہے.........بولو تو پیگ بناؤں۔''

''میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے دو پیگ بنا کر گلاس میز پر رکھ دیا اور اپنا گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ پیا——— آپ کو تعجب ہو رہا ہے کہ میں شراب پی رہی ہوں۔ اپنے گاہکوں کو خوش رکھنے کے لئے کبھی کبھی وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کے لئے دل تیار نہیں ہوتا.........لیکن جب شراب پیتی ہوں تو کچھ پل کے لئے تسکین مل جاتی ہے۔ اپنا ماضی بھول جاتی ہوں.........وہ لمحے فراموش ہو جاتے ہیں''——— اچانک وہ خاموش ہو گئی جیسے الفاظ نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

میں خاموش اسے ہی تک رہا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں کئی خیال آ رہے تھے۔ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا———

''آپ خاموش کیوں ہیں.........کچھ تو بولئے.........آپ بولتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے جیسے میں اس دنیا کی نہیں ہوں.........کسی اور دنیا سے آئی ہوں۔''

''آں.........''——— میں چونکا، کچھ دیر اسے یونہی دیکھتا رہا۔ پھر نہ جانے کس جذبے کے تحت میں بول پڑا———

''میرا......... ہاں تم ہی میرا ہو.........جو محل کے سکھ چین کو تیاگ کر جنگل جنگل کرشن کے گیت گاتی پھر رہی تھی۔ کرشن

تمہارے خواب میں آتے تھے۔تمہیں کرشن سے پیار ہو گیا تھا.........میرے تو گردھر گوپال دوجے نہ کوئی.........''

اس بار وہ ہنسی نہیں۔خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔اس نے مجھے اپنے نرم ونازک ہاتھ سے چھوا۔میرے جسم کو ٹٹولا' میرے دل پر ہاتھ رکھ کر میری دھڑکن کو سنا پھر میری آنکھوں میں جھانکا——''

''نہیں.........تم ایک عام آدمی نہیں ہو سکتے..........اگر عام آدمی ہوتے تو اب تک میرے جسم کا تکہ بوٹی کر چکے ہوتے۔ تم کون ہو؟ اب میرے اندر تجسس جاگ رہا ہے کہ تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم کرلوں۔بتاؤ نا تم کون ہو؟''

''میں ایک عام آدمی ہوں.........لیکن تم ایک عام لڑکی نہیں ہو۔میں تمہیں صدیوں سے جانتا ہوں۔تم دروپدی ہو.........تمہارا ہی بھرے دربار میں چیر ہرن ہوا تھا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا کچھ دیر کے لئے پھر آپ ہی آپ کھو گئی۔پتہ نہیں خلا میں کیا ڈھونڈتی ہوئی بہت دور نکل گئی۔اتنی دور کہ دوری کا اسے بھی اندازہ نہ ہوا۔اور جب واپس لوٹی تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطرے موتی کی طرح جگمگا رہے تھے۔میں نے اس کے آنسو دیکھ لئے اور ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پوچھ دیئے۔وہ میرے سینے سے لگ کر سسکنے لگی کچھ دیر کے بعد اسے اپنے سینے سے الگ کر کے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ہولے ہولے اس کا چہرہ نارمل ہونے لگا اور آنکھیں حسب دستور مسکرانے لگیں۔

''تم مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو' مونا لیزا.........''

''آں' مونا لیزا.........اچھا نام دیا ہے آپ نے.........میں آپ کی مونا لیزا ہی تو ہوں.........مونا لیزا.........''

اس نے یہ نام نہ جانے کتنی بار اپنی زبان سے ادا کیا۔

میں نے آہستہ سے اس کے نازک ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا پھر میں نے اپنی گہری نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ابھی رات کا دوسرا حصہ سہم سہم کر گزر رہا تھا۔سیاہی آہستہ آہستہ سارے ماحول پر اپنی حکومت جما چکی تھی ہر طرف خاموشی نے اپنی چادر پھیلا دی تھی لیکن کمرہ میں جو بلب روشن تھا اس روشنی میں ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔وہ میرے اور قریب آ گئی۔ اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔میں پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔وہ مجھ سے بالکل چمٹ گئی پھر سرگوشی کے انداز میں بولی——

''میں تمہاری ہوں' ہمیشہ سے تمہاری۔اگلے جنم میں تم ہی میرے دیوتا تھے اور میں تمہاری پجارن' تم پوجنئے ہو۔''

''مجھے دیوتا نہ بناؤ.........میں ایک انسان بن کر اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں.........بس ایک انسان.........''

''میں اس جنم میں بھی تمہاری ہی بن کر رہنا چاہتی ہوں.........مجھے اپنا بنالو.........ہمیشہ کے لئے.........''اس نے میرے شرٹ کا بٹن کھول کر اپنے ہاتھ سے میرے سینے کو سہلانے لگی۔

جب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں کمزور پڑنے لگا ہوں دفعتاً اسے خود سے الگ کیا۔وہ چونک پڑی۔اسے ذرا بھی یقین نہیں

تھا کہ میں اسے اس طرح جھٹک دوں گا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں اس کے کپڑے اتاروں گا اور.........

اب وہ بستر پر گر کر اپنی تیز سانسوں کو درست کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں بہت دیر تک وہ اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑی رہ۔ٹوٹتی ہوئی رات اس کے پہلو سے گزرتی گئی۔

کافی دیر کے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ شاید اس کا نشہ اتر چکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں کرسی پر بیٹھا صبح کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی——

''کیا ہوا تھا؟''——اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

میں نے اخبار ہٹا کر اسے دیکھا——''کچھ تو نہیں ہوا۔ صرف تم اگلے جنم کی بات کر رہی تھی۔''

''اگلے جنم کی؟''

''ہاں!''——اسے حیرت ہوئی۔ اس نے سامنے ٹنگی ہوئی گھڑی پر نگاہ کی۔

''بیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اب تمہارے پاس صرف چار گھنٹے مزید بچ رہے ہیں۔ کیا تم اس چار گھنٹے کو بھی یوں ہی ضائع کر دو گے؟''

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا——''تم بار بار وقت گزر جانے کی بات کیوں کر رہی ہو۔ وقت کا کام ہی ہے گزر جانا۔ یہ وقت بھی گزر جائے گا۔''

''گزر تو جائے گا لیکن تم نے اچھی خاصی رقم ادا کی ہے اور میرا استعمال نہیں کیا ہے تو مجھے لگے گا کہ میں نے یہ روپیہ حرام کا لیا۔''

''تم اپنے دل سے یہ خیال نکال دو۔ میں نے جو روپیہ ادا کیا ہے وہ تمہارے ساتھ وقت گزارنے کے لئے ادا کیا ہے اور وہ وقت تم نے گزارا ہے.........''

وقت دھیرے دھیرے گزر رہی جاتا ہے۔ نہ جانے کتنے واقعات' حادثات اور لمحات لے کر.........ہم دونوں کے درمیان سے بھی وقت چپکے چپکے گزر رہا تھا اور وہ لڑکی اس لئے پریشان تھی کہ میں نے جس کام کے لئے.........نہیں نہیں.........اس نے جس کام کے لئے مجھ سے روپئے لئے تھے وہ کام ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ پلنگ پر خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ میں نے خاموشی توڑی——

''ایک پیگ لوگی؟''——

اس نے میری طرف دیکھا——''نہیں اب صبح ہونے والی ہے۔''

''جانتی ہو کچھ دیر قبل تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟''

''کیا کہا تھا؟''

''یہی کہ تم ہمیشہ کے لئے میری بن کر رہنا چاہتی ہو.........صرف میری.........''

وہ خاموش رہی۔نہ اس نے مسکرایا نہ میرے بات کی نفی کی۔

''بہت دیر سے تم نے مجھے کسی نام سے نہیں پکارا.........''

اس نے اپنی نگاہیں میرے چہرے پر ٹکا دیں۔

''اب تم اپنا نام خود طے کرو۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔میں قدرے جھجکتے ہوئے کہا.........

''میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں ہمیشہ کے لئے..........''

وہ لڑکی کچھ بولی نہیں اسی طرح خموش بیٹھی رہی۔میں اٹھ کر اس کے پاس گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازہ کی طرف بڑھا لیکن اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور انتہائی بوجھل لہجے میں میری طرف دیکھ کر کہا——

''نہیں.........'' کچھ دیر خموش رہی پھر بہت مضبوط لہجے میں کہا.........''ہوا' خوشبو اور روشنی قید نہیں کی جا سکتی مسٹر.........''

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی اور میں ہک بک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔میری دی ہوئی رقم کے کمرے کے ایک کنارے کے ٹیبل پر پڑی۔میرا منہ چڑا رہی تھی۔

●●

زینہ

اب میں ہوں——!

میرا یہ کمرہ ہے——!!

شب ہے اور شب کی تنہائی ہے——!!!

باہر بارش کی رم جھم ہے۔کون جانے باہر بارش میں کون بھیگ رہا ہے۔ میں تو کمرہ میں بغیر بارش کے بھیگ رہی ہوں۔ میرے پاس سے بارش کا موسم تو بہت پہلے ہی گزر چکا ہے اور جو موسم میرے پاس ہے اس میں صرف دھوپ ہے سائبان کہیں نہیں' نہ بارش ہے نہ سوکھا' نہ بہار ہے نہ خزاں.........میں نے یہ موسم خود اپنے لئے منتخب کیا ہے کہ جس میں کوئی رنگ نہ ہو۔ میں زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جینے کا یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ایک رنگ میری زندگی میں بھی آیا تھا.........بے حد حسین رنگ' جس رنگ میں اس قدر شرابور ہوگئی تھی کہ اس میں ڈوبتی چلی گئی تھی اور اس طرح ڈوبی کہ اس سے نکلنے میں مجھے کئی سال لگ گئے.........ہاں ایک رنگ.........

رنگ ونور کی سوغات لئے وہ میری زندگی میں آیا تھا۔ایک شام جب موسم میں خاصی تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔رمشا باہر لان میں بیٹھی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔عدیل لان سے گزرتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔آہٹ پا کر رمشا چونکی اور ایک خوبصورت نوجوان کو دیکھ کر اچانک کھڑی ہوگئی——

''آپ.........آپ کون؟''——اس نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

''جی.........میرا نام عدیل ہے.........مجھے سر نے گھر پر ملنے کو کہا تھا۔اس لئے آ گیا۔کیا سر تشریف رکھتے ہیں'' ——عدیل نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

''ابو یونیورسیٹی سے نکل کر کسی دوست کے گھر چلے گئے ہیں کچھ ہی دیر میں لوٹ آئیں گے۔آپ تشریف رکھئے''—— رمشا نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔عدیل بیٹھ گیا۔اس نے لان کے ادھر ادھر دیکھا پھر گھر کو دیکھا۔کافی خوبصورت گھر تھا لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ دوسری بار رمشا کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھے۔رمشا پھر سے اپنی کتاب پڑھنے میں کھوگئی۔کچھ

ہی دیر بعد گاڑی کے ہارن نے دونوں کی نگاہیں دروازے کی طرف مرکوز کردیں۔ واچ مین دروازہ کھول رہا تھا۔ کار پورٹیکو میں آکر رکی۔ پروفیسر انیس امام لان کی طرف بڑھے۔ انہوں نے عدیل کو کار سے اترتے ہی دیکھ لیا تھا۔

''کہو برخوردار کیسے ہو؟ـــــــ انیس امام دونوں کے قریب آ گئے۔

''سر بالکل خیریت سے ہوں۔''

''چلو ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ہاں رمشا یہ میرا اسٹوڈینٹ ہے عدیل' جو میری نگرانی میں ریسرچ کر رہا ہے اور یہ میری بیٹی رمشا۔ یہ بھی ریسرچ کر رہی ہے۔''

عدیل نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا' رمشا نے جواب دیا اور کہا۔

''ابو آپ ڈرائینگ روم میں بیٹھئے میں چائے بھجواتی ہوں۔''

پروفیسر انیس امام اور عدیل ڈرائنگ روم میں آ گئے اور رمشا کچن کی طرف مڑ گئی۔

اس شام بہت زور کی بارش ہو رہی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے کھڑکیوں کے پردوں کو بھگوتے ہوئے کمرہ میں داخل ہو رہے تھے۔ رمشا جو کرسی پر بیٹھی کسی کتاب کو پڑھنے میں محو تھی' سرد ہوا کے جھونکے کی وجہ سے اس کا دھیان کھڑکی کی طرف گیا۔ اس نے اُٹھ کر باہر کا منظر دیکھا۔ کیا سہانا موسم تھا۔ باہر بارش جھما جھم ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑی رہی۔ اسی لمحہ دروازہ پر دستک ہوئی۔ وہ چونک پڑی۔ اس بارش میں بھیگتے ہوئے کون یہاں آ سکتا ہے۔ اس نے اپنے کمرہ سے نکل کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے عدیل کھڑا تھا۔ وہ بارش کی وجہ سے پوری طرح بھیگ گیا تھا۔

''آپ ایسے موسم میں؟''ـــــــ رمشا نے اس کے بھیگے ہوئے سراپا کا جائزہ لیا۔

''وہ.........سر نے بلایا تھا۔ کچھ نوٹس لینے تھے''ـــــــ عدیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''کل بھی آ سکتے تھے۔ بارش میں بھیگ کر آنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''میں سر کا حکم ٹال نہیں سکتا۔ انہوں نے کہا تھا شام میں آجانا تو میں آ گیا۔''

''اندر آیئے''ـــــــ رمشا دروازے سے ہٹ گئی۔

عدیل ڈرائینگ روم میں آ گیا۔ رمشا نے ٹاول لا کر دیا۔

لیجئے سر کا پانی پوچھ لیجئے۔ نہیں تو سردی لگ جائے گی۔ میں ابو کا کرتا پائجامہ لا کر دیتی ہوں۔ پہن لیجئے۔ یہ کہہ کر رمشا اندر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے ایک کرتا پائجامہ لے کر ڈرائنگ روم میں آئی اور عدیل کی طرف بڑھایا۔ ''لیجئے کپڑے تبدیل کر لیجئے جب تک میں چائے بناتی ہوں''ـــــــ یہ کہہ کر رمشا نے کچن کا رخ کیا۔

وقت کی شاخ سے ٹوٹ ٹوٹ کر پتے بکھرتے رہے۔ سرد وگرم ہوا کے نہ جانے کتنے موسم آتے جاتے رہے۔ عدیل کی سادگی اور شرافت نے نہ جانے کب رمشا کے دل پر پیار کی دستک دے دی۔ اسے پتا بھی نہ چلا۔ اب وہ اس کے لئے بے چین رہنے لگی۔ اس کے آنے کا انتظار کرتی اور جب وہ شام میں آتا اسے بے حد سکون ملتا۔ وہ اس کے لئے ناشتہ اور چائے پہلے سے تیار رکھتی اور رات کا کھانا کھلا کر ہی واپس کرتی۔

عدیل کو بھی شاید اسی وقت کا انتظار تھا۔ دونوں محبت کے جھولے پر بیٹھ کر پینگیں لیتے رہے اور وقت اپنا سفر طے کرتا رہا۔

عدیل سوچتا——

رمشا کیا ہے؟ کس اب وگل سے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ جب وہ میرے پاس بیٹھتی ہے۔ مجھ سے باتیں کرتی ہے تو مجھے کتنا اچھا لگتا ہے۔ اس دن بھی وہ عدیل کے پاس بیٹھی تھی نہ جانے عدیل کے دل میں کیا ہوا کہ اس نے رمشا کے جسم کو چھو دیا۔ عدیل کے چھوتے ہی رمشا کے پورے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کے زیر اثر اس کے سینے کے زیروبم تیز ہو گئے اور عدیل اس قیامت رعنا کے جلال و جمال کو اس طرح محسوس کرتا رہا جیسے اپنی سدھ بدھ کھو دی ہو۔ سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں اور سرد ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے جلد ٹھنڈی بھی ہو گئیں۔

عدیل کا ریسرچ مکمل ہو گیا اور پروفیسر انیس امام نے اسے ایک کالج میں لکچرر کی نوکری بھی دلوا دی۔ جب انہیں رمشا اور عدیل کی محبت کا علم ہوا تو دونوں کی شادی کروا دی۔

وقت بوند بوند گرتا رہا اور آہستہ آہستہ عدیل میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ دولت اور شہرت کے پیچھے اس تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ رمشا ڈر گئی۔ وہ سمجھاتی——

''ہمارے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے' پھر آپ دولت اور شہرت کے پیچھے اس طرح کیوں بھاگ رہے ہیں۔''

''میں اس مقام تک پہنچنا چاہتا ہوں جہاں کم ہی لوگ پہنچ پاتے ہیں اور اس کے لئے میں کسی حد تک جا سکتا ہوں۔''

عدیل میں جو تبدیلی آئی تھی اس نے رمشا کے اندر ایک بے چینی سی پیدا کر دی تھی۔ اکثر عدیل آدھی رات کو لوٹتا۔ اب اس نے شراب بھی پینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے مراسم تھے۔ ساہتیہ سنگم کے ڈائرکٹر' ادب وثقافت کے وزیر' سوچنا پرسارن منتری کے پی۔ اے' روز ان لوگوں کے قصے سناتا۔ ان کی عیاشی اور بد چلنی کا واقعہ بیان کرتا۔ ان کی بیویوں کے ناجائز تعلقات کے بارے میں جانکاری دیتا۔ رمشا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ عدیل یہ سب بتا کر اس سے کیا چاہتا ہے۔

ایک شام عدیل رمشا کو لے کر ایک پارٹی میں گیا۔ وہاں نام چین ہستیاں موجود تھیں۔ عدیل نے ساہتیہ سنگم کے ڈائرکٹر سریندر ناتھ سے ملوایا۔

''ان سے ملو ساہتیہ سنگم کے ڈائرکٹر سریندر ناتھ' بڑے بڑے ادبی ایوارڈ ان کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ جسے چاہیں دے سکتے

ہیں اور اس سال کا ایوارڈ مجھے دلانے کا وعدہ کیا ہے۔ کیوں سریندر ناتھ جی؟''——عدیل پر شراب کا نشہ چڑھنے لگا۔

''بالکل! لیکن کچھ بھی کہئے عدیل صاحب آپ بہت قسمت والے ہیں کہ آپ کو اتنی خوبصورت بیوی ملی ہے''—— سریندر ناتھ نشے میں جھوم رہے تھے۔ رمشا کو برا لگا۔ وہ وہاں سے چلی جانا چاہتی ہے لیکن عدیل نے ہاتھ پکڑ کر ایک ٹیبل پر بٹھا دیا اور کچھ ہی دیر میں کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل لے کر آیا۔

''لو ٹھنڈا پی لو۔''—— رمشا نے نہ چاہتے ہوئے بھی بوتل ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگی۔ اسے اس ماحول سے وحشت سی ہونے لگی تھی مگر اپنے شوہر کی وجہ سے زہر کے گھونٹ پیتی رہی کچھ ہی دیر میں رمشا پر نشہ طاری ہونے لگا۔ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ عدیل مسکراتا ہوا اس کے پاس آیا—— ''کیا ہوا میری جان؟''

''میرا سر چکرا رہا ہے''

''چلو تھوڑی دیر کمرہ میں آرام کر لیتے ہیں، جب سر کا درد ٹھیک ہو جائے گا گھر چلیں گے''—— عدیل نے اسے سہارا دے کر ایک کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹا دیا۔ وہ جیسے ہی کمرے سے باہر آیا سریندر ناتھ وہاں پہنچ گئے۔ دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں اشارہ کیا۔ سریندر ناتھ اندر کمرے میں چلے گئے اور عدیل پھر سے ہال میں آ گیا۔

جب صبح رمشا کی آنکھ کھلی تو خود کو اپنے بیڈ روم میں پایا۔

عدیل اس کی بغل میں سویا ہوا تھا۔ رمشا کا سر بھاری لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ وہ سمجھ گئی رات میں کچھ ایسی انہونی ضرور ہوئی ہے جس کا اُسے علم نہیں ہے۔ اُسے بس اتنا یاد آ رہا تھا کہ عدیل نے اسے کولڈ ڈرنک لا کر دیا تھا پھر کچھ یاد نہیں۔

عدیل اُٹھا تیار ہو کر کالج چلا گیا۔ رمشا دن بھر پریشان رہی—— کیا عدیل نے کولڈ ڈرنک میں کچھ ملا دیا تھا۔ جس سے مجھے نشہ آ گیا اور پھر.........نہیں عدیل ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ اس حد تک نہیں گر سکتا لیکن اسے عدیل کا جملہ یاد آیا.........میں اس مقام تک پہنچنا چاہتا ہوں جہاں کم ہی لوگ پہنچ پاتے ہیں اور اس کے لئے میں کسی حد تک جا سکتا ہوں۔

ایک مہینے کے بعد عدیل کو ساہتیہ سنگم کا ایوارڈ مل گیا۔ وہ بہت خوش تھا لیکن رمشا اندر اندر رو رہی تھی۔ عدیل نے اپنی کامیابی کے لئے رمشا کو سیڑھی بنایا تھا۔

رمشا کو زینہ بنا کر عدیل شہرت کی بلندی طے کرتا رہا۔ دولت کا انبار لگاتا رہا اور رمشا ہر روز ٹوٹتی رہی، بکھرتی رہی۔ اسے سمجھاتی رہی، اس نے چاہا اپنے ابو سے بات کرے لیکن پھر سوچتی وہ ہارٹ کے مریض ہیں اگر ان کو شاک لگا تو ان کی جان بھی جا سکتی ہے پھر وہ کیا کرے۔ اسی طرح عدیل کا زینہ بنتی رہے یا کوئی فیصلہ کرے۔ آخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ ایک کالج میں جب لکچرر کی آسامی آئی تو اس نے فارم بھرا اور کسی طرح نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ عدیل کو تعجب ہوا کہ بغیر میری پیروی کے یہ پوسٹ اسے کیسے مل گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رمشا نوکری کرے۔ صرف اس کا زینہ بنی رہے۔ اس نے پوچھ ہی لیا۔

''رمشا یہ نوکری تمہیں کیسے ملی جب کہ اس پوسٹ کے لئے کئی بڑی بڑی پیروی تھی۔''

''عدیل صاحب آپ نے مجھے زینہ بنا کر بہت کچھ حاصل کیا۔ میں نے سوچا اس بار یہ زینہ اپنے لئے استعمال کروں اور اس میں کامیاب ہوگئی۔ آج میں آپ سے رشتہ منقطع کرتی ہوں۔ کیونکہ میں کسی کا زینہ بن کر زندگی جینا نہیں چاہتی۔ آپ کو دولت اور شہرت مبارک ہو.........خدا حافظ!''

یہ کہہ کر رمشا نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور گھر سے نکل گئی۔

●●

آگ ابھی باقی ہے

کنتی نہ جانے کتنی سیاہ بدصورت راتوں کو اپنے اندر سرایت کر چکی تھی۔ رات بھر نینداور بے خوابی کے عالم میں کمرہ میں ٹہلتی رہتی تھی۔کبھی آدھی رات کے گہرے سناٹے میں کنتی کے تاریک کمرے سے سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔کبھی کراہیں‘ کبھی آہیں جیسے کوئی بھاری پتھر اس کے سینے پر رکھ دیا گیا ہو جس کے نیچے بے تاب کراہیں دم توڑ رہی ہوں۔اکثر جب وہ گہری نیند میں ہوتی تو مسز شرما کی تیز نوکیلی آواز اس کے ذہن پر اس طرح وار کرتی کہ بوکھلا کر نیند سے بیدار ہو جاتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی اس وقت اس کا پورا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا اور پھر اسے تمام رات نیند نہیں آتی۔وہ اپنے بدن کو ٹٹول کر دیکھتی کہ کہیں چابک کے نشان اس کے بدن پر تو نہیں ابھر آئے ہیں۔کبھی وہ محسوس کرتی کہ اس کے سینے پر اپنے چر چراتے ہوئے بھاری جوتوں سے چلتا ہوا ڈاکٹر شرما گزر گیا ہے۔رات گزرتی رہتی ایک ایک کر کے آسمان کے تارے افسردہ سے افسردہ تر ہوتے جاتے وہ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی جنوبی سمت کی طرف اونچی اونچی عمارتوں کی رنگین جاگتی سوتی بتیاں جلتی بجھتی رہتیں رات گزرتی ہی چلی جاتی اور وہ گھونٹ گھونٹ ساری سیاہ رات کو پیتی چلی جاتی۔

’’زندگی کسی کو کہاں جینے دیتی ہے۔‘‘—— کنتی اکثر سوچتی—ہر پل یہ زندگی ظالمانہ نگاہ کرتی نظر آتی ہے جیسے پوچھ رہی ہو کہ تم کون ہو؟—— تمہارا وجود کیا ہے؟—— کیوں ہے؟——اور کس کے لیے ہے؟——اس کا جواب کنتی کے پاس نہ تھا۔

دن کا اُجالا پھیلتے ہی وہ گھر کے کام میں اس قدر مصروف ہو جاتی کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ انسان بھی ہے۔مشین کی طرح رات کے بارہ بجے تک گھر کے سارے کام نپٹا کر جب وہ اپنے چھوٹے سے تاریک کمرہ میں آ کر بستر پر اپنے تھکے جسم کو پھیلا دیتی تو کچھ پل کے لیے اسے سکون کا احساس ہوتا لیکن درد سے اس کا پور پور ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا—— کاش اس کے تھکن سے چور بدن کو کوئی زور زور سے دباتا تا کہ اس کی تھکن دور ہو جاتی مگر وہاں نہ کوئی اس کے درد کو سمجھنے والا تھا اور نہ اس کی تھکن کا کسی کو احساس تھا۔مسز شرما اسے دن بھر کولہو کے بیل کی طرح پیرتی رہتی۔بات بات پر نہ صرف جھڑکتی بلکہ مار بھی بیٹھتی شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ کنتی مسز شرما سے نہ پٹتی ہو۔ ڈاکٹر دیپک شرما کا رویہ بھی حاکمانہ سا رہتا جب تک وہ گھر پر موجود رہتے ایک ایک کام کے لیے کنتی کو ہی آواز دیتے دیر ہونے پر کھا جانے والی نظروں سے گھورتے کبھی کبھی غصے میں آ کر جوتے سے مار بھی بیٹھتے۔کنتی کئی بار زخمی ہو چکی

تھی لیکن اس کے زخم کو دیکھنے والا وہاں کون تھا۔ ڈاکٹر شرما نے دس ہزار دے کر گویا اسے زر خرید غلام بنالیا تھا۔

کنتی تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ رنگ سانولا لیکن روپ متاثر کن اور جسم گداز تھا۔ ڈاکٹر دیپک شرما جب اس بار بہار اپنے گاؤں فتح پور گئے تھے تو کنتی کو ساتھ لے کر آ گئے تھے۔ کنتی ڈاکٹر شرما کے گاؤں میں مسہر محلے میں رہتی تھی۔ اس کا باپ کھیت میں مزدوری کرتا تھا اور ماں ڈاکٹر شرما کے گھر جھاڑو پوچھا کا کام کرتی تھی۔ کنتی کی ایک بڑی بہن پارو تھی جو بانس کی لکڑیاں بنتی' اور بازار میں جا کر فروخت کرتی تھی۔ کنتی سے چھوٹے کئی بھائی بہن تھے جو دن بھر آپس میں لڑائی جھگڑے کرتے رہتے تھے۔ کنتی کی ماں نے کسی طرح پارو کا بیاہ مسہر پریوار میں ایک لڑکے سے طے کر دی تھی لیکن بیاہ کے لیے اس کے پاس روپئے نہ تھے۔ ایک دن موقع دیکھ کر ڈاکٹر شرما سے بولی——

''مالک ہم اپنی بیٹی پارو کے بیاہ طے کر دیے ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''بابو مگر ایک بات ہے؟''

''ہاں ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟''

''مالک آپ جانتے ہیں کہ ہم گریب لوگ ہیں' دو وکت کی روٹی کا انتجام کسی طرح کر لیتے ہیں۔ سادی بیاہ میں تو کچھ نہ کچھ خرچہ تو آئے گا اور ہمرے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ بیٹی بیاہ سکیں۔''

''ہم سے کیا چاہتی ہو۔''

''اگر کچھ روپیہ کی مدد کر دیتے تو بڑا احسان ہوتا اور پنیہ بھی۔''

ڈاکٹر شرما کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر گویا ہوئے۔

کتنے روپے میں کام چل جائے گا؟''

''ڈاکٹر بابو دس ہجار دے دیتے تو ہمرا سارا کام نپٹ جاتا۔''

''دس ہزار تو زیادہ ہے۔ ہم ایک دو ہزار کی مدد کر سکتے ہیں۔''

''بابو اتنے میں کا ہوگا۔ دس ہجار دیجیے گا تو کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلاوے کے جرورت نہ پڑی۔''

ڈاکٹر شرما دیر تک سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کرتے ہیں۔

''بگنی تیری ایک بیٹی کنتی بھی تو ہے۔ کتنے سال کی ہے؟''

''بابو بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔''

''ایسا کر و اسے میرے ساتھ دلّی بھیج دو۔ وہاں ہمارے ساتھ رہے گی۔ گھر میں جھاڑو پوچھا کر دیا کرے گی۔ میری پتنی اکیلی رہتی ہے۔ اس کا بھی دل لگے گا۔ گھر میں جو پکے گا وہ بھی کھائے گی۔ کپڑے وغیرہ دے دیا کروں گا اور پانچ سو روپیہ بھی

تمہیں ہر مہینے بھیج دیا کروں گا۔اگر تمہیں منظور ہے تو بولو میں دس ہزار روپیہ دے کر تمہاری مدد کروں گا۔اور اسے واپس بھی نہیں مانگوں گا۔

''ڈاکٹر بابو وہ تو ٹھیک ہے لیکن پہلے اپنے پتی اور کنتی سے پوچھ کر دیکھتے ہیں اگر وہ دونوں تیار ہو گئے تو مجھے کوئی اتراج نہیں ہے۔''

''پوچھ لو اتنا اچھا موقع تمہیں نہیں ملے گا۔دلّی میں تو نوکر بہت مل جائیں گے لیکن ہمیں جان پہچان کا کوئی آدمی چاہیے جو چوبیس گھنٹے ساتھ رہے۔''

''ٹھیک ہے بابو بات کر کے آپ کو بتا دیں گے۔''

''ہاں ایک اور بات بتا دوں کی کنتی پانچ سال تک واپس نہیں آئے گی البتہ جب جب گرمی کی چھٹی گزارنے گاؤں ہم لوگ آئیں گے کنتی کو بھی ساتھ لے کر آئیں گے اور ساتھ ہی لے کر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے مالک ہم اس بارے میں کل بتا دیں گے۔''

کنتی دلّی آنے کے بعد خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہے ـــــــ بالکل اکیلی ـــــــ بن بادل اور پیاس سے بھری پانی تلاش کرتی بہت دور نکل آئی تھی۔ جیسے کسی بالکل ہی چٹیل ریگستان میں آ گئی ہو۔ وہ نہ جانے کب سے یوں ہی کھڑی ہے خاموش ـــــــ اور اس کے پاس سے کئی موسم گزرتے جا رہے ہیں۔جب بھی رات کا پچھلا پہر بھیگتا کنتی اپنے کمرے میں سسک سسک کر رو پڑتی۔وہ کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔رونے سے اس گھر کے مکینوں کی نیند میں خلل پڑ سکتا تھا۔کنتی کا درد ہر لمحہ بڑھتا رہا تھا کہ اب درد اس کے مقدر کی کتاب کے ہر ورق کا عنوان بن گیا تھا۔وہ محسوس کرتی کہ اس کے آس پاس نہ کوئی پیڑ ہے نہ کوئی سایہ بس صحرا ہی صحرا ہے اس کے ہونٹ پیاس سے سوکھ چکے ہیں اور آنکھیں جل رہیہیں۔زندگی کنتی کو ہر لمحہ رلا رہی ہے جلا رہی ہے۔پھر بھی وہ جیئے جا رہی ہے۔غموں کو پیئے جا رہی ہے۔اس کی خوشی کا پرندہ ایک ایسے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا ہے جس کے سبھی دروازے کھلے تو ہیں مگر وہ پھر بھی مقید ہے۔وہ جانتی ہے اگر یہاں سے بھاگ گئی تو ڈاکٹر شرما اسے کسی بھی کیس میں پھنسا کر جیل بھجوا سکتے ہیں۔اس کے گھر والوں کو پریشان کر سکتے ہیں۔

کنتی ہر لمحہ اپنا احتساب کرتی۔

اس کا گناہ کیا ہے؟

یہی کہ مسہر گھر میں پیدا ہوئی۔بچپن سے مفلسی اس کی تقدیر بنی رہی اور اب بے بسی اس کا مقدر..........

''ہے بھگوان یہ تیرا کیسا انصاف ہے کہ کسی کو اتنا امیر بنا دیتا ہے کہ وہ کھاتے کھاتے مر جاتا ہے اور کوئی بھوک سے جان

دے دیتا ہے۔ امیر امیر ہی بنتا جا رہا ہے اور غریب غربت ہی میں مرجاتا ہے۔ یہ امیری غریبی کی کھائی کب کم ہوگی۔ کب ہر انسان برابر ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں میرے حصے کا ہر سکھ امیروں نے اپنی عالی شان عمارتوں میں قید کر رکھا ہے۔''

کنتی آنکھیں بند کیے بہت دیر تک سوچتی رہی۔ ٹوٹتی ہوئی رات اس کے پہلو سے گزرتی گئی اور وہ بے سدھ آنکھیں بند کیے اپنے بوسیدہ کمرہ کے بوسیدہ بستر پر پڑی رہی ایک تل چٹہ اس کے قمیص کے اندر گھس گیا اور سرسرانے لگا۔ یہاں سے وہاں تک۔ اس نے قمیص کے اوپر تل چٹہ کو انگلیوں سے زور سے دبایا۔ تل چٹے نے سرسرانا چھوڑ دیا۔ وہ ادھ مرا ہو چکا تھا۔ کنتی نے تل چٹہ کو قمیص سے باہر نکالا اور زمین پر پٹخ کر پیر سے مسل دیا۔ اس کے اندر غصے کا ایک لاوا ابھرا تھا۔ وہ تل چٹہ مرنے کے بعد ختم ہو گیا۔ مسز شرما بھی اسے تل چٹہ کے موافق نظر آئی۔ ہر لمحہ وہ بھی اس کے بدن پر رینگتی رہتی اور نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی۔

کنتی کے غصے میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا لیکن وہ غصے کو دبائے رکھتی کہ اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ اپنا دکھڑا کسے سناتی۔ سننے والا تھا کون؟ بس اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اسے لگتا کوئی آئے گا اور اس نرک سے نکال کر اسے لے جائے گا لیکن دور دور تک اس کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

آج اس کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مسز شرما رہ رہ کر اس پر ناراض ہو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ ابھی وہ باتھ روم سے کپڑا صاف کر کے نکلی ہی تھی کہ مسز شرما نے اسے روک لیا۔

''صبح سے برتن کچن میں رکھا ہے۔ صاف کون کرے گا تیرا باپ؟''

''مالکن صبح سے کام ہی تو کر رہی ہوں۔ بخار آ گیا ہے' اس لیے دیر ہوگئی۔''

''نخرے دکھاتی ہے۔ بخار لگنے کا بہانہ کرتی ہے۔ یہ سب یہاں نہیں چلنے والا۔ تیری ماں کو دس ہزار روپیہ دیا ہے اور ہر مہینے پانچ سو روپیہ بھجواتی ہوں' حرام کا پیسہ نہیں آتا ہے۔''

''مالک کام ہی تو کر رہی ہوں۔''

''منہ لگاتی ہے ایک طمانچہ دوں گی تو سارا بخار اتر جائے گا۔'' ——— مسز شرما غصے سے کانپ رہی تھی۔

کنتی مڑ کر جیسے ہی کچن میں داخل ہونا چاہ رہی تھی مسز شرما نے زور سے چلایا ——— ''اے ادھر آ.....''

کنتی پلٹی۔ اس نے مسز شرما کے تیور کو دیکھا۔ وہ غصے سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آج پھر اس کی پٹائی ہونے والی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی نہ جانے اس کے اندر کہاں سے اتنی جرأت پیدا ہوگئی کہ مسز شرما کے قریب پہنچتے ہی ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔ مسز شرما لڑکھڑا کر گر پڑی۔ کیونکہ وہ اس ناگہانی واقعہ کے لیے تیار نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی کنتی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

●●

سیاہ رات کی صبح

دھندلکا رفتہ رفتہ ظلمت کی سرحد میں داخل ہو رہا تھا——

رات دھیرے دھیرے اپنے چہرے کو سیاہ مائل بنا رہی تھی۔ میں بستر پر لیٹا تھا۔جھپکی آ گئی تھی لیکن کمرہ میں کسی عورت کی سسکیوں کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔ یہ کون ہے جو میرے بند کمرے میں آ گئی ہے۔کہیں کوئی آسیب تو نہیں۔میں نے اُٹھ کر جیسے ہی لائٹ آن کرنا چاہا ایک نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی——

''نہیں روشنی مت جلانا.........میں اپنا بدنما چہرہ تمہیں دکھانا نہیں چاہتی۔''

میرے ہاتھ رُک گئے۔میں نے اندھیرے میں اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن بیحد گھنے اندھیرے میں اس کا چہرہ نظر نہیں آیا۔

''تم کون ہو؟''——میں کچھ پل کے لئے خوف زدہ ہو گیا۔

''میں دلّی ہوں!''——درد میں ڈوبی ایک آواز ابھری

''دلّی؟''——میں حیرت میں ڈوب گیا۔

''ہاں میں دلّی ہوں.........انگنت بار لوٹی گئی، برباد کی گئی.........اُجاڑی گئی.........ہر بار تو غیروں نے لوٹا تھا۔اس بار اپنوں نے ہی شرمسار کر دیا۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ خرافات کب تک دیکھتی رہوں گی.........تم میرے درد کو سمجھ رہے ہو نا؟ ....تم میرے درد کی کہانی کیوں نہیں لکھتے.........کیا میرا درد تمہارا درد نہیں ہے۔بولو.........''

میں ٹیبل کے پاس رکھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ٹیبل لیمپ جلایا، قلم اٹھایا۔کاغذ سامنے ٹیبل پر پڑے تھے۔میں کیا لکھوں؟ کہاں سے شروع کروں دفعتاً یاد آیا کہ رات کے دس بج رہے ہیں اور میری بیٹی ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔مجھے تشویش ہونے لگی میں نے اپنا موبائیل اٹھا کر اس کا نمبر ڈائیل کیا۔وہ بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔

''منتشا کہاں ہو تم؟ اتنی رات ہو گئی ہے اور تم ابھی تک واپس نہیں آئی ہو۔''

''پاپا.........پاپا.........''

''کیا بات ہے بیٹی تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔''

''پاپا.........میں اپنے ہوسٹل سے بس پر سوار ہوئی تو میرے ساتھ اور کئی لوگ بھی سوار ہو گئے لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ وے لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں تو یہاں کے راستے سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہوں۔''

''ابھی تم کہاں ہو؟''

میں اس وقت بسنت کنج میں ہوں اور بس میں سوار کچھ لوگ مجھے ہوسناک نگاہوں سے گھور رہے ہیں۔''

''بس میں اور کتنے مسافر ہیں؟''

''مزید دس لوگ ہیں لیکن پتہ نہیں یہ سب کب کہاں اتر جائیں۔''

''اگلے اسٹاپ پر تم بس چھوڑ دو اور آٹو لے کر گھر آ جاؤ۔''

''ٹھیک ہے پاپا میں ایسا ہی کرتی ہوں۔''

''میں بے حد پریشان ہو اُٹھا۔ میری بیٹی کا کچھ انجانے لوگ پیچھا کر رہے ہیں۔ چند مہینے قبل میں نے میڈیکل کالج میں اس کا داخلہ کرایا ہے۔ میں دو دن قبل ہی اس سے ملنے دلّی آیا ہوں۔ میں اپنے مخصوص لاج میں ٹھہرا ہوں۔ میری بیٹی ہوسٹل سے نکل کر آج میرے پاس ملنے کے لئے آ رہیے اور راستے میں یہ واقعہ۔ میں اُٹھ کر کمرہ کا بلب روشن کرنا چاہتا ہوں لیکن اسی لمحہ احساس ہوتا ہے کہ کوئی میرے کمرہ میں موجود ہے اور ایک بار پھر میرا ہاتھ رک گیا اور کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا تم بہت پریشان نظر آ رہے ہو؟''

''میری بیٹی کا چند لوگ پیچھا کر رہے ہیں اور وہ خود کو غیر محفوظ تصور کر رہی ہے۔''

''یہاں محفوظ کون ہے۔ یہ دلّی ہے اور یہاں سب کچھ اب بدل چکا ہے۔ دلّی کی تہذیب طور طریقے.........رہن سہن، بول چال.........اخلاق.........انسانیت.........

''وہ تو ہے لیکن رہنا تو اسی ماحول میں ہے۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ میں پھر کاغذ کی طرف جھک گیا۔

ہاں تو میں کیا لکھوں۔

اس دن کچھ عجیب بات ہوئی۔

ایک میدان میں ایک بہت بڑا مجمع تھا۔ بے شمار لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ایک بڑا سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔ کوئی لیڈر تقریر کر رہا تھا۔ وہاں موجود آدمی زور زور سے اس کی تقریر پر تالیاں بجا رہے تھے۔

''جاگو.........بھارت کے لوگو جاگو.........اگر ابھی نہیں جاگے تو کبھی نہیں جاگو گے.........یہی جاگنے کا وقت ہے۔ اگر جاگ گئے تو سب کچھ بدل جائے گا۔''

''بھئی یہ کسے جاگنے کے لئے کہہ رہا ہے''——مجمع سے ایک آدمی نے اپنے بغل والے سے پوچھا۔

''پتہ نہیں ....ہم سب تو یہاں جاگے ہوئے ہیں ہی۔ مجھے تو مجمع میں کوئی بھی سوتا ہوا نظر نہیں آرہا ہے۔''——— دوسرے شخص نے کہا۔

''ارے وہ دیکھو اسٹیج پر ایک نیتا سویا ہوا ہے۔شاید اسے ہی جگا رہا ہے''——— تیسرے شخص نے اسٹیج کی طرف اشارہ کیا۔

''بھئی یہ تو اسٹیج ہی ہے۔ہمارے لیڈر تو پارلیامنٹ میں بھی سوئے رہتے ہیں''——— پہلے شخص نے کہا۔

''کیا واقعی ہم جاگ رہے ہیں؟''——— دوسرے شخص نے پھر ایک سوال اُچھالا۔

''بالکل! دیکھتے نہیں ہماری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں''——— پہلے شخص نے اپنی آنکھیں مٹمٹائیں۔

''ہاں آنکھیں تو کھلی ہوئی ہیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں ان کی آنکھوں سے جو تقریر کر رہا ہے''——— تیسرے شخص نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اور میری زبان؟''——— پہلا شخص پھر ایک سوال اُچھالا۔

''زبان تو میری ہی ہے لیکن بول رہے ہیں وہ،جو وہ کہلوانا چاہ رہے ہیں''——— تیسرے شخص نے کہا۔

''اور ذہن؟''

''ہمارے ذہن پر بھی ان ہی کا قبضہ ہے ہم ان ہی کے دماغ سے سوچتے ہیں۔''

''تو ہمیں کیا کرنا چاہئے''——— پہلے شخص نے تیسرے شخص سے پوچھا۔

''یہاں سے چلنا چاہیے۔ جتنا زہر انہیں بھرنا تھا ہمارے ذہن میں بھر دیا ہے۔اب ہم اس زہر کو عوام میں جا کر اگلیں گے۔''

''چلو بھائی چلو''———

میں دیکھ رہا ہوں وہاں ایک بڑے درخت پر کئی طرح کے پرندے چیں چیں کر رہے ہیں۔تالیوں کے شور میں پرندوں کی آوازیں گم ہوتی جا رہی ہیں۔وہ پرندے کیا بول رہے تھے کہیں انسانوں کا مذاق تو نہیں اڑا رہے تھے۔ہنس تو نہیں رہے تھے۔ اسی پل وہاں ایک دھماکہ ہوا اور بھگدڑ مچ گئی۔لوگ گرتے پڑتے بھاگ رہے ہیں۔کوئی گر رہا ہے۔آدمی پر آدمی چڑھ رہا ہے۔ ہر آدمی اپنی جان بچا کر محفوظ مقام تک پہنچنا چاہتا ہے لیکن کون سا مقام محفوظ ہے۔

میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے میری بیٹی ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔ میں پھر موبائیل سے اس کا نمبر ڈائیل کرتا ہوں۔موبائیل کا سوئچ آف ملتا ہے۔ میں کئی بار کوشش کرتا ہوں۔ میں بے چین ہو اٹھتا ہوں۔کیا میں جا کر دیکھوں وہ کہاں ہے لیکن میں اسے کہاں تلاش کروں گا۔اس وقت تو اس نے بتایا تھا کہ بسنت کنج میں ہے پھر اس نے آٹو پکڑا ہوگا یا بس پر ہی سوار رہی ہوگی۔بس کس روٹ سے آرہی ہوگی۔ یہ بھی مجھے پتا نہیں تو میں کیا کروں۔کیا میں پولس کو خبر کروں کہ میری

بیٹی غیر محفوظ ہے کچھ انجانے لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں لیکن پولس تو یہی کہے گی ابھی کوئی واقعہ تو ہوا نہیں ہے؟

میرا ذہن ایک بار پھر اس عورت کی طرف چلا جاتا ہے جو مجھ سے اپنی کہانی لکھوانا چاہتی ہے۔

میں کیا لکھوں؟

کیا میں اس کی کہانی لکھ پاؤں گا۔ میرا ذہن ایک بار پھر بھٹک جاتا ہے۔

میرا ذہن بار بار بیٹی کی طرف مرکوز ہو جاتا ہے۔ وہ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ کچھ درندے اس کے تعاقب میں ہیں اور وہ ان سے ڈر کر بھاگ رہی ہے۔ میں بھی بھاگ کر اس کے پاس جانا چاہتا ہوں لیکن وہ عورت اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی ہے اور مجھ سے اپنی کہانی لکھوانا چاہتی ہے اور میں نے ابھی تک اس کی کہانی کا آغاز بھی نہیں کیا ہے یا آغاز ہو گیا ہے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا' کیونکہ اپنی بیٹی کی وجہ سے میں کافی پریشان ہوں۔ میرے اندر ایک خوف سرایت کر گیا ہے۔ میں بھاگ کر اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ اسے درندوں کے چنگل سے بچانا چاہتا ہوں لیکن اس عورت کی کہانی؟ کیا مجھے اس کی کہانی لکھنی چاہیے یا کہانی کو چھوڑ کر اپنی بیٹی کی فکر کرنی چاہیئے۔

وقت کہاں کسی کے روکے رکتا ہے۔ وہ تو بہتا ہوا دریا ہے۔ بہتا چلا جاتا ہے۔ گھڑی نے جب چار بجنے کا اعلان کیا تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ صبح ہونے کو ہے اور میری بیٹی ابھی تک واپس نہیں آئی ہے۔ موبائیل کا سوئچ آف بتا رہا ہے۔ عین اسی وقت میرے موبائیل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں خوف زدہ ہو کر موبائیل اٹھایا۔

''ہیلو..........!''——— میری آواز کانپ رہی ہے۔

''میں پولس انسپکٹر وجے بول رہا ہوں۔ ایک لڑکی جس کا ریپ کر کے پھینک دیا گیا تھا۔ زخمی حالت میں ملی ہے۔ اسے رام منوہر لوہیا اسپتال میں بھرتی کرا دیا گیا ہے۔ اس کے موبائیل پر لاسٹ کال آپ ہی کا تھا۔ آپ اس کے پتا جی ہیں۔ آپ ہسپتال پہنچیے۔''

میں کانپ گیا۔ جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ میں جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ آٹو لیا اور اسپتال پہنچ گیا۔ جہاں میری بیٹی زندگی اور موت سے جھوجھ رہی ہے اور بلآخر زندگی کی کشاکش سے آزاد ہو کر مالک حقیقی سے جا ملی۔

میں ابھی ابھی اپنی بیٹی کی آخری رسم ادا کر کے اپنے کمرے میں لوٹ آیا ہوں۔ وہ عورت ابھی تک میرے کمرہ میں موجود ہے۔ وہ سسک رہی ہے۔ میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں لیکن بجھے دل سے اپنے پلنگ پر آ کر گر جاتا ہوں۔ اس کی سسکیاں اسی طرح ابھر رہی ہیں اور میں آہستہ آہستہ پتھر میں تبدیل ہو رہا ہوں۔ میری آنکھوں میں رونے کے لئے آنسو بھی نہیں ہے اور نہ ماتم کرنے کے لئے حوصلہ اور ماتم کروں بھی تو کس کا۔ میری بیٹی کے ساتھ جو ہوا اس کا؟ لیکن اس شہر میں تو ہر روز اس طرح کے واقعات رونما ہو رہے ہیں تو کیا وہ سب میری بیٹیاں نہیں ہیں؟

کمرے میں پھیلے کپڑے اور ضروری سامان سمیٹ کر اپنے بیگ میں ڈال کر اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا ہوں لیکن بار بار اس

عورت کی آواز میری سماعت سے ٹکرا رہی ہے——

''کہانی کار، میری کہانی کب لکھو گے؟''

●●

یہ آگ کب بجھے گی

راحت کی آنکھیں ہر دم دروازے کو تکتی رہتی ہیں کہ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلے گا اور نوید بیگ لیے دندناتا ہوا اندر داخل ہوگا۔

''لو میں آ گیا تمہارا انتظار ختم''——راحت ٹھگی سی کھڑی رہ گئی دروازہ اسی طرح بند تھا نہ دروازہ کھلا تھا اور نہ نوید وہاں موجود تھا۔

جب رات اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے گھر میں اندھیرے کے ساتھ سمٹ جاتی ہے تو یاد دلاتی ہے ماضی کا وہ ہر ایک پل جب اس کی خوشیوں کے آسمان پر چاند نکلتا تھا۔ اس کی پلکوں پہ احساس کا جگنو چمکتا تھا۔ تارے جھلملاتے تھے۔ راحت اور نوید کی پہلی ملاقات شادی کی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ اس دن کی گہما گہمی اور شور وغل جو چاروں طرف پھیلا جا رہا تھا۔ چمکیلے لباس مسکراتے چہرے، چمکتی نگاہیں، یوں لگتا تھا جیسے کائنات کی ساری دلفریبیاں یہاں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ نوید جب سے یہاں آیا تھا بس راحت کو ہی دیکھ رہا تھا۔ زرق برق لباس سے لدی پھندی وہ ادھر ادھر پھدک رہی تھی۔ وہ اس قدر مصروف نظر آ رہی تھی جیسے شادی کی ساری ذمہ داری اسی کے سر پر ہے۔ مہمانوں کا خیر مقدم کرنا ان کو ساتھ لے جا کر نشست پر بٹھانا پھر ان کی خاطر داری کرنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی وہ ایک مہمان کو ان کی نشست پر بٹھا کر پلٹی ہی تھی کہ ٹھیک اس کے سامنے نوید کھڑا مل گیا اگر وہ اپنے قدم نہ روکتی تو یقیناً ٹکرا جاتی۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ نوید نے بہت ہی معصومیت سے کہا——''آپ بے حد حسین ہیں۔ خدا نے شاید آپ کو فرصت میں بنایا ہے۔''

''جی!''——وہ گڑبڑا گئی۔ پہلی بار کسی نے راحت کی اس طرح تعریف کی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر نوید کو دیکھا۔

''میرا نام نوید ہے۔ میں دولہے کا خالہ زاد بھائی ہوں۔ ممبئی کی ایک کمپنی میں سافٹ ویئر انجینئر ہوں۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟——نوید نے ایک ہی سانس میں اپنا مکمل تعارف پیش کر دیا۔

''جی.........جی.........'' راحت ایک بار پھر گڑبڑا گئی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کہے۔ نوید نے سب کچھ اپنے بارے میں

اتنی جلدی جلدی بتا دیا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔اس نے ایک بار پھر نوید کو بھر پور نگاہوں سے دیکھا جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔نہ چاہتے ہوئے بھی جلدی سے اپنا نام بتا دیا۔

''میرا نام راحت ہے اور.........''اس پر شرم حائل ہوگئی اور وہ جلدی سے ہٹ گئی۔

''سنئے ....تفصیل تو بتاتی جایئے.........''راحت نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا اور بھیڑ میں گم ہوگئی۔

''عجیب لڑکی ہے۔اس ماڑن ایج میں بھی انیسویں صدی کی لڑکی کی طرح شرما رہی ہے مگر کچھ بھی ہو اس کا حسن دلفریب ہے۔اداؤں میں جادو ہے۔چہرے پر رعنائی ہے اور آنکھیں مست کر دینے والی ہیں۔''

راحت کچھ لمحے کے لیے تنہا ہوتی تو ضرور سوچتی کہ نوید نے اپنے بارے میں مجھے سب کچھ کیوں بتایا۔اس محفل میں اور بھی تو لڑکیاں ہیں۔مجھ سے بھی خوبصورت اور حسین لیکن مجھ میں کیا خاص بات نظر آ گئی جو مجھے روک کر اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور میرے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔چھوڑو اس طرح کی محفل میں چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔دولہے کی طرف سے ہیں۔ممکن ہے مذاق کیا ہو.........وہ اپنے خیالوں کو جھٹک کر دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئی۔

نوید جیسے ہی وہاں سے ہٹ کر اپنی نشست کی طرف بڑھا۔فرزانہ بھابھی ٹکرا گئیں۔

''بھابی آپ؟.........چلئے کافی پیتے ہیں۔''

''آں ....کافی تو بعد میں بھی پی لیں گے پہلے یہ بتایئے اس لڑکی سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟''——فرزانہ بھابی نے مسکرا کر پوچھا۔

''بھابی کچھ نہیں، بس وہ لڑکی مجھے اچھی لگی۔اس لئے اس کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا''.........نوید نے صاف صاف بتا دیا۔

''اور اس نے کچھ نہیں بتایا۔بدھو مہاراج کسی اجنبی لڑکی سے اچانک سب کچھ جان لینا چاہیں گے تو تھوڑے ہی بتائے گی۔آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ایسے معاملے میں سب سے کارآمد بھابی ہوتی ہے۔پہلے یہ بتایئے وہ لڑکی آپ کو پسند ہے؟''

''جی بھابی''——نوید کے چہرے پر سرخی رینگ گئی۔

''تو رشتے کی بات چھیڑوں؟''——فرزانہ بھابی کا چہرہ بھی کھل گیا تھا۔

''پتا نہیں اس کے گھر والے یہ رشتہ منظور کریں گے یا نہیں یا ممکن ہے راحت ہی مجھے ناپسند کر دے.........''نوید نے تشویش ظاہر کی۔

''آپ ....ایسا کیوں سوچتے ہیں۔میرے دیور میں کیا کمی ہے۔ہینڈسم' اسمارٹ' سافٹ ویر انجینئر' اچھی نوکری ....ایک لڑکی کو اور کیا چاہئے۔میں ابھی راحت کی امی سے بات کرتی ہوں اور اس بار ممبئی آپ اکیلے نہیں جائیں گے دلہن لے کر جائیں گے۔''

''بھابی........'' نوید شرما گیا۔

''شرمانے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے پیارے دیور کا یہ چھوٹا سا کام ابھی کر کے آتی ہوں'' ـــــــ فرزانہ بھابی مسکراتی ہوئی عورتوں کی جھرمٹ میں غائب ہوگئیں اور نوید زیر لب مسکراتا ہوا کافی کے اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔ کافی کا کپ لے کر اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گیا اور کافی پینے لگا۔

فرزانہ بھابی کی کوشش رنگ لائی دونوں گھر والوں نے اس رشتہ کو منظور کرلیا۔ اس رشتے سے نوید کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک آ گئی تھی جیسے اس کی پتلیوں کے طاق پر اچانک چراغ جل اٹھے ہیں۔

راحت بھی بے حد خوش تھی۔ وہ گنگناتی ہوئی آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ آئینے میں اس کا سراپا جھوم رہا تھا۔ اپنے لمبے بالوں کو سنوارتے ہوئے اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہے اور پھر وہ اپنے آپ شرما گئی۔

شادی کی تاریخ اتنی جلد طے ہو جائے گی نوید نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ دراصل فرزانہ بھابی نے ضد پکڑ لی کہ نوید شادی کر کے ممبئی واپس جائیں گے اور اگلی بار آ کر اپنی دلہن کو ساتھ لے جائیں گے۔ فرزانہ جیسی پیاری بہو کی بات کون ٹال سکتا تھا۔ سب نے حامی بھر دی اور نوید برات لے کر راحت کے گھر پہنچ گیا۔

''حجلۂ عروسی میں داخل ہوتے ہی نوید نے پاس جا کر ہولے سے کہا ـــــــ

''راحت'' نوید کی آواز نے راحت کی روح کو کیفیت بخشی۔

''جی'' مسرت میں ڈوبی ہوئی راحت کی آواز ابھری۔

نوید نے اپنی آنکھوں میں شرارت بھر کر کہا ـــــــ ''آخر میں نے آپ کو حاصل کر ہی لیا وہ بھی پندرہ دنوں کے اندر۔''

راحت شرم سے سمٹ گئی۔ نوید اسے شرماتا ہوا دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''کچھ کہئے گا یا یوں ہی خاموشی میں پوری رات گزر جائے گی۔'' نوید کی آواز ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

''آپ نے کہنے کے لئے چھوڑا ہی کیا ہے۔ پہلی ملاقات میں ایک لڑکی کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ میں تو اسی دن آپ کی گرویدہ ہوگئی تھی۔ آپ کی سادگی پر مرمٹی تھی۔ کتنی سچائی تھی آپ کی باتوں میں۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا تھا۔ جیسے آپ مجھے برسوں سے جانتے تھے'' ـــــــ راحت نے پیار بھری نظروں سے نوید کو دیکھا۔

''لیکن آپ بھاگ کیوں گئی تھیں؟''

''مجھے شرم آ رہی تھی۔ میں نے پہلی بار کسی اجنبی لڑکے سے اس طرح روبرو بات کی تھی۔''

''کیا وہ شرم آج بھی حائل ہے۔''

راحت نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو آج شرم کی ساری دیواریں کیوں نہ گرا دی جائیں۔''

راحت نے شرما کر اپنے ہاتھوں سے چہرہ کو چھپالیا۔نوید نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور راحت کی آنکھوں سے شرم کا پردہ دھیرے دھیرے سرکنے لگا۔

جس دن نوید ممبئی واپس ہورہا تھا راحت اداس تھی۔نوید نے اس کے اداس چہرے کو دیکھ کر کہا——''آپ اداس کیوں ہیں؟ کچھ ہی مہینے کی تو بات ہے۔اگلی بار آؤں گا تو آپ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ڈھنگ کا فلیٹ وغیرہ لے لوں تو اپنی پیاری پیاری بیوی کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔راحت میں آپ کو وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جس کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں''——راحت نے اپنی بانہیں نوید کے کندھے پر رکھ دیں۔

''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔میری خوشی تو آپ ہیں۔بس مجھے عمر بھر کے لئے آپ کا ساتھ' آپ کا پیار چاہئے۔''راحت نوید کے سینے سے لگ گئی۔

''اب جانے بھی دیجئے ٹرین کا وقت ہوگیا ہے۔نیچے سب لوگ میرا انتظار کررہے ہیں''——راحت نے سینے سے الگ ہوکر آنچل کو سر پر رکھا' کوئی دعا پڑھی اور نوید کے چہرے پر پھونک دیا۔

''خدا آپ کو اپنے امان میں رکھے۔''

وقت تو بہتا ہوا دریا ہے ہمیشہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔نوید کو گئے کئی مہینے گزر گئے تھے مگر راحت کو لگتا کئی سال گزر گئے ہیں۔مدّت ہوگئی ہے۔صدیاں گزر گئی ہیں۔جدائی کی آگ اسے ہر لمحہ جلاتی رہتی۔اس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا۔وہ ہر وقت نوید کی یادوں میں کھوئی رہتی۔حالانکہ نوید کا ہر روز فون آتا لیکن فون سے اسے کسی طرح کا قرار نہ آتا۔نوید کو وہ بالکل اپنے سامنے دیکھنا چاہتی تھی جسے چھو سکے' محسوس کرسکے' پیار کرسکے مگر نوید تو بہت دور اپنے کام میں مصروف تھا کہ اچانک ایک چنگاری نے دھیرے دھیرے آگ کی شکل اختیار کرلی۔ممبئی میں ایک تحریک نے جنم لیا۔شمالی بھارت کے لوگوں کے خلاف نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا۔

نوید پریشان تھا ایک نئی مصیبت منہ اٹھائے کھڑی تھی' جگہ جگہ احتجاج ہورہے تھے۔کئی لوگ مارے گئے تھے۔بہت سارے لوگوں نے شہر کو خیر باد کہہ دیا تھا۔شمالی بھارت کے لوگ دہشت میں جی رہے تھے۔نوید نے سوچا——''اب یہ آنکھیں اور کیسے کیسے منظر دیکھیں گی؟''

اس کے چاروں طرف خون پھیلا تھا۔بیتابی بڑھ گئی تھی۔ایسا لگتا تھا وہ طوفان کی زد میں ہے اور یہ طوفان اس کا سب کچھ بہا کر لے جانے کے لئے آمادہ ہے۔وقت خون کی بوندوں میں ڈھلتے جارہے تھے۔نوید کا مضمحل چہرہ دیکھ کر کوئی بھی آسانی سے پتہ لگا سکتا تھا کہ وہ بے حد پریشان ہے۔ابھی وہ مزید سوچ پاتا کہ موبائیل کی گھنٹی نے اس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع کردیا۔اس نے ٹیبل سے موبائیل اٹھایا۔راحت کی کال تھی۔

''آپ کیسے ہیں؟ ٹی۔وی۔ پر کیسی کیسی خبریں آرہی ہیں؟''

''ابھی تک تو محفوظ ہوں لیکن کب تک محفوظ رہ پاؤں گا کہہ نہیں سکتا۔ میرا ایک دوست جو میری ہی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ کل پوسٹ آفس کے قریب اس کی لاش ملی تھی۔ ابھی شمشان گھاٹ سے جلا کر لوٹا ہوں''——نوید بے حد پریشان تھا۔

''آپ ایسا نہ کہیں، میرا دل لرز رہا ہے۔ آپ فوراً گھر آجایئے۔ اگر زندگی بچی تو بہت نوکریاں مل جائیں گی اور نہ بھی ملی تو کسی طرح محنت مزدوری کرکے زندگی کاٹ لیں گے۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ بس آپ کی زندگی میرے لئے سب سے عزیز ہے۔''

''ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں لیا ہے لیکن صبح تک ضرور کسی نتیجہ پر پہنچ جاؤں گا۔ جیسا بھی ہوگا میں کل فون کردوں گا۔''

''آپ کل پر کیوں ٹال رہے ہیں۔ رات میں کوئی گاڑی ملتی ہے تو اسے ہی پکڑ کر شہر سے نکل جایئے۔ ریزریشن اور اے۔سی۔ کا چکر چھوڑیئے اور جنرل باگی کا ٹکٹ لے کر بھاگئے وہاں سے''——راحت بہت پریشان تھی۔

''ٹھیک ہے میں اپنے باس کو ای۔میل کرکے جو پہلی گاڑی ملتی ہے اسے ہی پکڑ کر آجاتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ۔''

نوید موبائیل آف کرکے کمپیوٹر آن کرتا ہے اور کمپنی کے مینیجر کو ای۔میل کرتا ہے کہ جس طرح ممبئی میں نفرت کا لاوا پھوٹ پڑا ہے۔ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اپنے وطن واپس جارہا ہوں۔ حالات بہتر ہوجائیں گے تو واپس لوٹ آؤں گا''——وہ جیسے تیسے کچھ کپڑے ایک بریف کیس میں رکھتا ہے۔ ٹرین صبح آٹھ بجے تھی۔ وہ صبح ہونے کا انتظار کرنے لگتا ہے۔

راحت کے لیے وقت کاٹنا مشکل ہوگیا تھا۔ نوید نے راحت کو بتادیا تھا کہ وہ صبح کی ٹرین سے آرہا ہے۔ راحت کو قدرے اطمینان تھا کہ نوید نے صحیح فیصلہ لیا ہے۔ ایسے ماحول میں وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس پر انتظار کا موسم گزرتا جارہا تھا۔

آج کی شام بجھی بجھی تھی۔ اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ نہ چاہ کر بھی وہ کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ ڈرائینگ روم میں نوید کے ابو اور امی ٹی۔وی۔ پر خبریں سن رہے تھے کہ اچانک ایک خبر نے سب کو ششدر کردیا۔

''ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ ریلوے ٹریک پر ایک لاش ملی ہے جس کی شناخت کرلی گئی۔ اس کا نام نوید احمد ہے جو ممبئی کی ایک کمپنی میں سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ وہ اپنے وطن لوٹ رہا تھا کہ کچھ انتہا پسندوں نے اسے ٹرین سے باہر پھینک دیا۔ جس سے کافی چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کی موت ہوگئی۔ لاش کمپنی کے مالک کو سونپ دی گئی ہے۔''

راحت کچن سے تقریباً دوڑتی ہوئی آئی اور خبریں سننے لگی۔ اسکرین پر نوید کی لاش کو بار بار دکھایا جارہا تھا۔ گھر کے باقی لوگ محوحیرت تھے کہ یہ اچانک کیسے ہوگیا۔ راحت کو گہرا شاک لگا۔

وہ چپ ہوگئی۔

اس کی آواز ختم ہوگئی۔

برسہابرس بیت چکے وہ اب بھی چپ ہے۔

راحت کی آنکھیں ہردم دروازے کو تکتی رہتی ہیں جیسے یہ آس لگی ہو کہ ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھلے گا اور نوید بیگ لئے

دندناتا ہوا اندر داخل ہو گا۔

''لو جی..........میں آ گیا' تمہارا انتظار ختم!!

●●
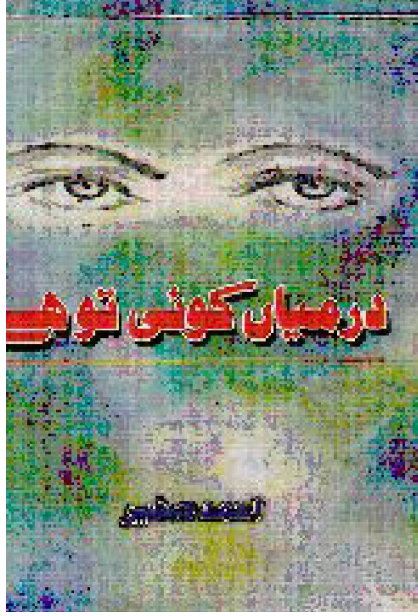
''درمیاں کوئی تو ہے''

ناقدین کی نگاہ میں

ڈاکٹر علیم اللہ حالی

''درمیاں کوئی تو ہے'' سے پہلے احمد صغیر کے دو افسانوی مجموعے ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' اور ''انا کو آنے دو'' سامنے آ چکے ہیں ان دو مجموعوں نے اردو افسانے کے نئے منظر نامے میں احمد صغیر کا قد خاصا بلند کر دیا۔ یہ بات ہر دور میں لکھنے والوں کے لئے سنجیدگی اور کبھی کبھی فکر مندی کا موضوع بنی رہی ہے کہ تخلیقی سطح پر بلند تر مقام حاصل کر لینے کے بعد اپنے آئندہ کے ادبی کیریر میں اسے کس طرح سنبھالے رکھا جائے۔ یہی فکر مندی فنکار کو خوب سے خوب تر کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ اور ادب میں اس کی وجہ سے نئی بلندیوں کا امکان بھی بنتا رہتا ہے۔ لیکن اپنی سابقہ حیثیت کو برقرار رکھنا یا اس کے آگے قدم بڑھانا بہتوں کے بس میں نہیں ہوتا۔ احمد صغیر نے بہت کم وقت میں فتح مندی کی اتنی منزلیں طے کر لیں ہیں کہ ایک لمبے تجربے کی مدّت میں ہر ان اپنے آپ سے سبقت لے جانے کی ہمت اکھٹا کرنا ان کے لئے بڑا چیلنج ہے۔

''درمیاں کوئی تو ہے'' کے افسانوں میں مجموعی طور سے احمد صغیر پہلے کے مقابلے میں کچھ بدلے بدلے نظر آتے ہیں۔ عوامی انقلاب، ناداروں سے ہمدردی، صاحبانِ ثروت کی طرف سے استحصال کا رویہ اور ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لئے اضطراب اور التہاب کے جس خاص تیور سے احمد صغیر پہچانے جاتے ہیں وہ یوں تو ''درمیاں کوئی تو ہے'' کے افسانوں میں بھی موجود ہے لیکن مسائل کی ترجیحات اقتدار کے تغیر کی جدو جہد میں فنکار کی تلخی اور جھلاہٹ میں کمی رومانی سروکار کے بیان میں بڑھی

ہوئی دلچسپی نیز اسلوب کے لحاظ سے اردو افسانے کی روایت سے قریب ہونے کا رویہ احمد صغیر میں تبدیلی کے نقوش بنا رہا ہے۔ مجموعہ ''درمیاں کوئی تو ہے'' چودہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ بیشتر افسانے اختصار کے حامل ہیں اور مختصر افسانے کی تکنیک کے پیمانے پر پورے اترتے ہیں۔ ان میں علامات اور اشارات سے ہٹ کر صراحت اور وضاحت کی خصوصیت ملتی ہے۔ بر سبیل تذکرہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ افسانہ عام بیانیہ اور وضاحتی اسلوب میں لکھنا ان معنوں میں دشوار تر ہوتا ہے کہ علامات' اشارات' استعارات اور رمز و کنایہ کے ذریعہ فنکار قاری کے دل بہلانے کا انتظام کر لیتا ہے اور بہت حد تک اپنی تخلیقی کمزوری چھپانے کی کوشش کر لیتا ہے۔ وضاحت وصراحت اور عام بیانیہ اسلوب کسی عیب کی پردہ پوشی نہیں کر پاتے۔ چنانچہ احمد صغیر کے یہ افسانے بھی ان کی تخلیقی مرتبے کے سلسلے میں سچ بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان چودہ افسانوں میں انہوں نے عصر حاضر کے معاشرے کی وہ تصویریں اتاری ہیں جو کہیں سے غیر فطری نہیں معلوم ہوتیں لیکن ان سبھوں میں اپنے مخصوص Treatment کی بنا پر احمد صغیر نے اجنبیت سے پیدا ہونے والی ایک دلکشی کی صورت حال قائم کر دی ہے جو قاری کو فن پارے سے وابستہ رکھتی ہے۔ سماجی نابرابری' ناداروں کا استحصال' غربت سے پیدا ہونے والی جنسی بے راہ روی اور ان سبھوں کے ساتھ ایک مجموعی ذہنی و خارجی تبدیلی احمد صغیر کے افسانوں میں رنگ بدل بدل کر سامنے آتی ہے۔ کہیں افسانہ ''درمیان کوئی تو ہے'' میں اخلاقی اور انسانی اقدار کے لحاظ سے ٹوٹتے ہوئے ہندوستان کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور حکومت انتظامیہ' سیاست اور سستی آئڈیولوجی کے تماشے دکھائے گئے ہیں۔ کہیں ''تعفن'' میں منوا ہے جو مسز ملکانی سے رابطہ کی وجہ سے ایک شدید نفسیاتی جھٹکے کا شکار ہوتا ہے۔ یہاں دولت مند لیکن لاولد مسز ملکانی کی داخلی شخصیت کی پرتیں کچھ عجیب طرح سے کھلنے لگتی ہیں جب وہ کوڑا کچڑا بیننے والے ایک کم سن غریب بچے کو دیکھ کر ممتا کے جذبے سے سرشار ہو جاتی ہے۔ اس کہانی کا عنوان اگر چہ ''تعفن'' رکھا گیا ہے لیکن مجھے کہانی کے اختتام پر مسز ملکانی کی شخصیت اور اس کے ردعمل سے ایک ایسی خوشگواری کا احساس ہوتا ہے جو ''تعفن'' کو خوشبو میں بدل دیتا ہے۔ افسانہ 'جائے امان' اگر ایک طرف اقلیت کی تحفظ کا مسئلہ کھڑا کرتا ہے تو دوسری طرف شہرکاری کے عفریت سے بھی خوف زدہ کرتا ہے۔ احمد صغیر کے افسانوں میں واقعات کی سطح پر تنوع تو ضرور ملتا ہے لیکن ان تمام وقوعوں میں ایک ایسے تغیر کی تمنا در آتی ہے جو خارجی سطح پر ہو یا ہو اور ہمارے ذہنو کو بھی یکسر بدل دے۔

''فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی'' کا کارو مانجھی' اس کی بیمار بیوی بدھنی اور نکسلی عورت لیڈر کامریڈ V ——یہ سب انتظامیہ کی بے بسی اور انقلاب کی آمد آمد کا پتہ دیتے ہیں۔ داتون بیچنے والی سگنی اس سے تعلق رکھنے والا سپاہی (ڈوبتا ابھرتا ساحل) 'شاکر' شبستاں' مہوش (منتظر لمحوں کی آواز) لکھمنیا' سمتا' ماسٹر صاحب (پناہ گاہ) اور اسی طرح متعدد کہانیوں میں پھیلے ہوئے متفرق کردار احمد صغیر کے یہاں کردار نگاری کی ابھرتی ہوئی ان کی صلاحیت کے روشن ثبوت ہیں۔ یوں تو احمد صغیر بسا اوقات تخلیقی سطح پر پریم چند کی اس تخلیقی فضا میں ڈوبتے نظر آتے ہیں جہاں انقلاب فطرت نگاری ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہے۔ لیکن جب احمد صغیر اس فضا سے نکلتے ہیں تو ''ڈوبتا ابھرتا ساحل'' جیسا کامیاب افسانہ سامنے لے آتے ہیں۔

شعر و ادب میں مصروف نئی نسل اردو زبان کے روایتی اور ثابقہ اقدار و معیار سے ہٹ کر ایک نئے لسانی تشکیلی دور میں داخل ہو رہی ہے یہاں اردو زبان ہندی سے اس قدر قریب ہوتی جا رہی ہے کہ اردو کو ایک مستقل زبان کہنے کے لئے ہمارے پاس صرف رسم الخط کا سہارا رہ گیا ہے۔ ورنہ الفاظ کی سطح پر نئی نسل کے اردو افسانہ نگاروں کے پاس اب الگ کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ چنانچہ احمد سغیر کے افسانوں میں عام طور پر گر بھ' سویکار' دھراتل' آشواسن' گگن چمبی' منورنجن' دکھ رہا ہے' (بجائے نظر آ رہا ہے) نیز بہت سے دوسرے الفاظ عہد حاضر میں اردو کے حوالے سے لسانی تبدیلیوں کے مظہر ہیں۔ یہ تبدیلی اردو زبان کے لئے منحوس ثابت ہوگی یا مبارک و مسعود ——— اس کے بارے میں فی الوقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی

''درمیان کوئی تو ہے'' احمد صغیر کا نیا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں جو کہانیاں شامل ہیں وہ عہد حاضر کی حسیت (Sensibility) اور آگہی کا بھر پور پتہ دیتی ہیں۔ موضوعات میں بڑی رنگا رنگی اور تنوع ہے لیکن شناخت کی انفرادیت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ یہ کہانیاں طبقاتی کشمکش' معاشی استحصال' سماجی جبر اور سیاسی منافقت کی کہانیاں ہیں لیکن احمد صغیر نے ان کو اس طرح دیکھا اور محسوس کیا ہے کہ ہمیں ان میں ایک نیا پن' تازگی اور طرفگی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کا شعور حیات روز بروز تابناک اور پہلودار ہوتا جا رہا ہے اور ان کا بیانیہ دن بدن نکھرتا جا رہا ہے۔ ان کی کہانیوں کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ارضی حقائق سے نبرد آزما ہیں ان سے بھاگ کر ہواؤں اور فضاؤں میں معلق کہانیاں نہیں ہیں۔ ان میں سچائیوں سے آنکھیں ملانے اور ان کے دل میں اتر جانے والی بصیرت اور جرات ہے۔ عصری معنویت کا جتنا گہرا شعور اور جتنی کربناک آگہی احمد صغیر کی کہانیوں میں محسوس ہوتی ہے وہ ان کے ہم عمر افسانہ نگاروں میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل چند کہانیاں تو ایسے سنگین اور اہم مسائل سے دوچار ہیں جن کو ہاتھ لگاتے ہوئے بڑے بڑوں کے ماتھے پر پسینہ جھلکنے لگے۔ احمد صغیر کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں بڑی اخلاقی جرات اور مردانگی کے ساتھ ان زمینی سچائیوں کو اپنی فنی تخلیقات کی گرفت میں لے کر قارئین کی آگہی اور بصیرت کو مثبت انداز میں متاثر کیا اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس مجموعہ کی پہلی کہانی ''درمیاں کوئی تو ہے'' اسی نوعیت کی کہانی ہے جس میں فن کار نے فاشزم (Facism) کے نت نئے روپ کو بڑی چابکدستی کے ساتھ بے نقاب کر دیا ہے۔ آگ اور خون کا جو کھیل فرقہ پرست اور انسان دشمن طاقتیں چاروں طرف کھیل رہی ہیں اس کی جھلکیاں اس کہانی میں فنکارانہ تکنیک کے ذریعہ اجاگر کی گئی ہیں۔ کہیں کہیں درمیان میں ڈرامائی مکالموں کے مدد سے پیکر تراشی کا جو عمل ملتا ہے وہ اس کہانی کو بے حد پر اثر اور جاندار بنا دیتا ہے۔ پوری کہانی تکنیک کے اس تجربہ کے باوجود بکھراؤ کا شکار نہیں ہوتی اور مکمل اکائی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

ولی دکنی نے کیا خوب کہا ہے: مفلسی سب بہار کھوتی ہے' واقعی افلاس انسان کے حس لطافت کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ ''تعفن'' ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں ایک ایسے بچہ کے کردار کا تجزیہ ہے جو کچرے اور کوڑے کرکٹ سے استعمال شدہ چیزیں

چن کر کباڑیوں تک پہنچا تا ہے اور جو پیسے ملتے ہیں اسی سے ماں اور بیٹے کے کچے پکے کھانے کا سامان فراہم ہوتا ہے مسلسل بد بو اور گندگی کے ماحول میں رہتے رہتے لطافت اور خوشبو کا احساس اس کی زندگی سے غائب ہو جاتا ہے چنانچہ جب مسز ملکانی نام کی ایک خاتون اس پر ترس کھا کر اس کو کھانا دیتی ہیں اور پیسے بھی دیتی ہیں تو وہ سمجھ نہیں پاتا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور جب ایک دن وہ لذیز کھانا اپنے ہاتھ سے اس بچے (منوا) کو کھلاتی ہے تو وہ خوشبو اور کھانے کی لذّت کی تاب نہ لا کر چکرا کر گر جاتا ہے اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔منوا کے کردار کا تجزیہ بڑا فن کارانہ اور عمیق ہے۔ ہمارے اردگرد غربت' افلاس کے جو روح فرسا مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں ان سے سبھی واقف ہیں لیکن احمد صغیر نے منوا کے کردار کا جو نفسیاتی تجزیہ کہانی کی بنیادی اور لازمی خصوصیات کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے پیش کیا ہے وہ ان کی فنی مہارت اور نفسیاتی بصیرت کا ثبوت ہے۔

نکسل واد آج ہمارے لئے ایک اہم سماجی اور سیاسی مسئلہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے مگر اردو افسانہ نگاروں نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے۔احمد صغیر کی کہانی ''فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی'' اسی مسئلہ سے برسر پیکار تخلیق ہے۔نکسل واد کے نام پر پولس کس طرح بے گناہ لوگوں کو جیل میں سڑاتی ہے اور کتنی بے رحمی کا سلوک ان کے ساتھ کرتی ہے اس سچائی کو فن کار نے بڑی نزاکت اور چابکدستی کے ساتھ اس افسانہ میں اجاگر کیا ہے۔آخری چند سطروں کے ایک جملہ میں پوری سچائی سمٹ آئی ہے۔

''کون سا جیل انسپکٹر؟ پھر کوئی جیل بریک آپریشن ہوگا اور مجھ جیسے بے قصور رہا کروا لئے جائیں گے تو آپ کیا کیجئے گا''۔

بے درد پٹائی اور غلیظ گالیوں کے جواب میں کارو مانجھی کا یہ جملہ کتنا بلیغ اور پرکار ہے۔اسی طرح ''سوانگ'' میں جو ہمارے سیاسی نیتاؤں کی منافقت اور کھوکھلے نعروں کے چہرے سے نقاب اتار پھینکی ہے آخری وار کتنا بھرپور ہے۔

''یہ نیتا کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے انسپکٹر صاحب کہ اس کی نقل بھی اتاری جائے تو وہ حقیقت بن جاتی ہے''۔

میں نے ان کہانیوں کا ذکر اس لئے کیا کہ ان سے پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک فن کار کی حیثیت سے احمد صغیر کا ضمیر کتنا زندہ' شعور کتنا گہرا اور تخلیقی طریق کار کتنا پر تاثر ہے۔

احمد صغیر جس طرح سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں اس کے پیش نظر یہ بات کسی قدر یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا مستقبل نہایت روشن اور تابناک ہے۔معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے کتاب عمدہ ہے۔

ڈاکٹر مولا بخش

احمد صغیر مابعد جدید افسانوی منظرنامے پر اپنی شناخت دلت کلامیہ کی تعبیر و تشریح کے ذریعے بنا چکے ہیں جس میں ترقی پسند آئیڈیولوجی کی بازگشت بھی موجود ہے۔''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' میں پرندہ ہندوستانی سماج کے دبے کچلے طبقے کا نشان ثابت ہوا۔ان کے دوسرے افسانوی مجموعے ''انّا کو آنے دو'' میں انّا متن کی ظاہری ساخت کی سطح پر ترقی پسند آئیڈیولوجی کی تمثیل ہے لیکن اس کردار کے باطن میں عصر حاضر کا دلت کردار ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

ان دو مجموعوں کے بعد زیرِ نظر افسانوی مجموعہ ''درمیاں کوئی تو ہے'' مصنف کے مذکورہ فکری دھارے کی اگلی کڑی معلوم ہوتی ہے۔ مجموعے کا یہ عنوان ایک طرف آج کی سیاسی صورت حال سے دو چار عام انسان کے بے دست و پا ہونے کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف اس امر کی طرف کہ آج کا اقتصادی، معاشی، معاشرتی، سماجی اور لسانی بحران سے پریشان عام انسانوں کی نجات کا راستہ ابھی مکمل طور پر بند نہیں ہوا ہے۔ احمد صغیر کا یہ افسانوی مجموعہ ان کی انفرادیت اور شناخت کو یقیناً مستحکم کرے گا۔

ڈاکٹر کوثر مظہری

۸۰ء کے بعد جن افسانہ نگاروں کی شناخت بنی ان میں احمد صغیر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں لیکن فنکاری یہ ہے کہ حقائق کی پیشکش میں وہ وقائع نگار نہیں بن جاتے بلکہ ان کی فکشن کی آنکھ حقائق کو دیکھتی، آنکتی ہے اور تب ان کی پیشکش کرتی ہے۔ وہ علامتی حقیقت نگاری کے بجائے سادہ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں۔ ان کی کہانی ''سوانگ'' پڑھتے ہوئے اندازہ ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں کیسے کیسے کردار موجود ہیں۔ ایک شخص کس مجبوری کے تحت روزی روٹی کے لئے کردار بدلتا رہتا ہے۔ احمد صغیر کی کہانیوں میں طبقاتی کشمکش کو پیش کرنے والی کہانیاں بھی ہیں۔ ''فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی'' کا کردار کارو مانجھی احتجاج کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ کہانی کار نے تخلیقی شعور سے کام لے کر طبقاتی کشمکش اور احتجاج کے عوامل کو پیش کیا ہے۔ اس میں ''کامریڈ V'' کی پیش کش عورت میں پیدا ہونے والے احتجاجی روّیے کو ظاہر کرتی ہے۔ نکسلی موومنٹ کے نقوش اس چھوٹی سی کہانی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک کہانی اس مجموعے میں ''پناہ گاہ'' ہے جس کا موضوع عام سا ہے۔ ایک غریب بے سہارا عورت جس کا شوہر مر چکا ہے، اس کی بیٹی جوان ہونے لگتی ہے، تو فطری طور پر عورت پریشان ہوتی ہے۔ زمانے کی بری نظروں سے بچانے کے لئے وہ اپنی بیٹی سمتا کو ماسٹر رام پریکھا سنگھ کی امان میں رکھ چھوڑتی ہے۔ وہ اسے پڑھاتا ہے لیکن دھیرے دھیرے وہ اس کی عصمت کو بھی داغدار کر دیتا ہے۔ یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المناک پہلو ہے۔

احمد صغیر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تخیلات کی بنیاد پر کہانیاں نہیں لکھتے۔ انہیں معلوم ہے کہ کہانیاں اسی معاشرے میں ہمارے آس پاس بکھری ہوتی ہیں۔ وہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ معاشرے کی کریہہ صورت کو خوبصورت لفظوں کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ ان خوبصورت مجموعے پر انہیں میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر محمد محفوظ الحسن

ایک اچھی کہانی کی تشکیل میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، زبان کی ہم آہنگی کی خاصی اہمیت ہے۔ اگر پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے، کردار بے جان، بے حس اور ٹھس ہیں۔ مکالمے چست و درست نہیں ہیں، زبان ناہموار ہے تو پھر کہانی بنتی تو ہے مگر جسے واقعی کہانی کہیں نہیں بنتی ہے۔ ایک مکمل کہانی کے لئے پلاٹ کا گٹھا ہوا ہونا، مکالموں کا چست و درست ہونا، کردار کا اپنے پیروں پر کھڑا رہنا اور متحرک رہنا، زبان کا موقع اور موضوع کے لحاظ سے ہموار و برمحل ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسان کی زندگی کے لئے سانس کا متوازن چلنا۔ اگر تنفس بڑھ جائے تو انسان نہ تو صحیح طریقے سے اُٹھ بیٹھ سکتا ہے اور نہ سلیقے سے چل پھر سکتا ہے اور نہ ہی

الفاظ کی سہی ادائیگی ہوسکتی ہے۔ یہی حال کہانی کا ہے۔ کہانی چونکہ کہی جاتی ہےاس لئے اس میں بیانیہ کا پُر اثر ہونا رواں دواں ہونا اشد ضروری ہے۔ اگر کہانی کو فنکار تاثر نہیں دے سکتا تو کہانی پڑھ اور سن تو لی جائے گی مگر اس کا تاثر سامع اور قاری پر جو ہونا چاہئے وہ اس سے محروم رہے گا۔ میری غرض ان باتوں سے محض اتنی ہے کہ کہانی بننے کے جو بنیادی عناصر ہیں ان میں اگر امتزاجی کیفیت نہیں آسکی ہے تو پھر کہانی نہ تو بن سکتی ہے اور نہ ہی بنی جا سکتی ہے۔

احمد صغیر اُردو کہانی کا مستند نام ہے یا نہیں یہ تو وہ طے کریں گے جو تنقید کی مسندِ عالیہ پر متمکن ہیں اور جو فتویٰ صادر کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ میں یہ بھی دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ احمد صغیر ترقی پسند ہیں یا جدید یا مابعد جدید۔ کچھ کو ان کی کہانیوں میں ترقی پسندی نظر آتی ہے تو کچھ ان میں جدید عناصر کی تلاش پر زور دیتے ہیں اور کچھ ان میں مابعد جدید کی دید و دریافت پر زور دیتے ہیں۔ میرا ماننا تو صرف یہ ہے کہ احمد صغیر کھلی آنکھوں والا، وسیع النظر فنکار ہے جو اپنے مشاہدات اور تجربات کو کاغذ کے کینوس پر خونِ جگر کی روشنائی سے لکھتا ہے۔ جن کے یہاں ادبی قدریں اپنی پوری فنی جمالیات کے ساتھ اپنے وجود کا احساس کراتی ہیں۔ احمد صغیر کی کہانیوں کے موضوعات معاشرے اور سماج کے ارد گرد پھیلے واقعات و حادثات ہیں۔ گذشتہ تین دہائیوں سے وہ متحرک اور فعال ہیں اور ان تین دہائیوں میں جو اور جس قسم کے واقعات، تحریکات ظہور میں آئی ہیں اس کے وہ صرف نہ چشم دید گواہ رہے ہیں بلکہ اس میں ایک باعمل کردار کی طرح انہوں نے اپنا رول ادا کیا ہے۔ اس دوران ان کے کئی افسانوی مجموعے اور ناول کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی کتابیں اشاعت کے مرحلوں سے گذر کر ناقدین عظام اور قارئین کرام سے اپنے فکری و فنی رچاؤ کا اقرار و اثبات کرا چکی ہیں۔

فی الوقت میرے پیش نظر ان کی ایک کہانی ''تعفن'' ہے۔ تعفن میں اس طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جسے عرف عام میں پسماندہ/ دلت کہا جاتا ہے اور جس کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت اور اہم ترین مسئلہ بھوک ہے۔ ہمارا ملک ایک جمہوری نظام کے تحت چلتا ہے اس جمہوری نظام میں مساوات کو بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ کیسا مساوات ہے کہ ایک بچہ عالیشان کوٹھیوں اور ایر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی گذارتا ہے تو دوسرا بچہ کوڑے کے ڈھیر پر پیدا ہو کر اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی دراصل اس عدم مساوات اور سماجی نابرابری کے خلاف ایک حساس انسان کا قلمی جہاد ہے اور باشعور فنکار کا خاموش احتجاج۔ انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے کئے جانے والے اعلانات، بچہ مزدوری کے خلاف حقوق اطفال کا دم بھرنے والی حکومت کی کارروائیاں محض دفتروں اور فائلوں کی نذر کیوں ہو جاتی ہیں؟ کیا جمہوریت میں مساوات کے یہی تقاضے ہیں؟ احمد صغیر کی یہ کہانی ان سوالات کا جواب بھی چاہتی ہے۔

کہانی میں تاثر پیدا کرنے کے لئے احمد صغیر نے تضادات کا سہارا لیا ہے۔ ویسے سچائی تو یہی ہے کہ زندگی کی ساری خوبصورتی تضادات میں ہی پنہاں ہے اگر اونچے محلات کے ساتھ ساتھ جھگی جھوپڑیاں نہ ہوں تو زندگی کی بے ربطی اور بے کیفی کا احساس کیسے اور کسے ہوگا؟

کہانی منوا کے کوڑا چننے کے عمل سے شروع ہو کر خوشبوؤں سے بے ہوش ہونے پر ختم ہو جاتی ہے۔ کوڑا چننے کے عمل سے منوا کے بے ہوش ہونے تک کی داستان بہت دلچسپ بھی ہے اور حیرت انگیز بھی۔ منوا جس کی ناک کوڑے کے تعفن کی عادی ہو چکی ہے گندگی جس کی خمیر اور ضمیر میں ڈھل چکی ہے وہ اس بھبکے سے اس قدر Conditioned ہو گیا ہے کہ کوئی دوسرا بھبھکا یا خوشبو کا کوئی دوسرا جھونکا اس کی ناک برداشت ہی نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ صفائی، ستھرائی اور خوشبوؤں میں جب اسے نہلا دیا جاتا ہے تو وہ اسے برداشت نہیں کر پاتا اور بے ہوش ہو کر فرش پر گر جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا خوشبوؤں سے بھی کوئی بے ہوش ہو سکتا ہے؟ خوشبوئیں تو انسانی دل و دماغ کو معطر کر کے تخیل کی نئی بلندیوں تک لے جاتی ہیں مگر یہ کیا کہ منوا خوشبو سے ہی بے ہوش ہو گیا۔ نالی کے کیڑے کو صاف پانی میں کبھی زندہ رہتے ہوئے آپ نے دیکھا ہے؟ یہ ایک اہم نفسیاتی نکتہ ہے جسے احمد صغیر نے بڑی فنّی چابکدستی سے اختتام کو دلکش اور پر تاثر بنانے میں استعمال کیا ہے۔

کہانی کا پلاٹ بہت سیدھا سادہ مگر گٹھا ہوا ہے۔ منوا ایک پسماندہ/ دلت لڑکا ہے جو اپنی پسماندگی کا علاج کوڑوں کے ڈھیر میں تلاشتا ہے۔ کوڑے کے ڈھیر کی سڑاند بھری بدبو اس کے دماغ میں کس طرح رچ بس جاتی ہے کہ اس کا بھبھکا اسے اچھا اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس بو کے علاوہ اور کوئی بو محسوس بھی نہیں کر سکتا۔ اس بدبو سے اس قدر Conditioned ہو جاتا ہے کہ دوسری کوئی بو اسے راس نہیں آتی ہے۔ جس کوڑے کچرے کے ڈھیر سے وہ اپنے لئے سامان زندگی تلاشتا ہے اسی ڈھیر سے کچھ دوری پر ایک بنگلے میں ایک عورت مسز ملکانی رہتی ہیں جو بے اولاد ہیں منوا کو کوڑا چنتے دیکھ کر ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات سر اُٹھاتے ہیں۔ وہ کسی طرح اس سے قربت چاہتی ہیں۔ پہلے اُسے بلاتی ہیں۔ منوا ڈرتا ڈرتا ان کے پاس جاتا ہے۔ مسز ملکانی اس سے کچھ پوچھتی ہیں پھر اُسے کھانا دیتی ہیں۔ یہ کھانا دینے اور کھلانے کا عمل بھی دھیرے دھیرے دوری کی حدود کو عبور کرتا ہوا قربت کی سرحد تک پہنچ جاتا ہے اور بعد میں وہ گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ منوا کو مسز ملکانی کا اور ملکانی کو منوا کا انتظار رہنے لگتا ہے۔ آخر کار ایک وہ گھڑی بھی آ جاتی ہے جب مسز ملکانی منوا کو گھر میں بلا کر نہلا دھلا کر ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر خوشبوؤں میں نہا کر کھانا کھلانا چاہتی ہیں تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔

احمد صغیر نے مسز ملکانی اور منوا کے کردار کی تراش خراش میں جس ہوشمندی سے کام لیا ہے وہ فن پر ان کی گرفت کا ثبوت ہے۔

مسز ملکانی ایک امیر کبیر عورت ہیں۔ آرام و آرائش کے سارے سامان موجود ہیں مگر ان کی زندگی میں ایک خلاء ہے اور وہ ہے اولاد کی نعمت سے محرومی۔ منوا کو کوڑا چنتے دیکھ کر مسز ملکانی کا ممتا کا جذبہ انہیں منوا کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ ابتداً وہ منوا کو دور سے دیکھ کر ممتا کی پیاس بجھاتی ہیں۔ پھر اسے پاس بلاتی ہیں۔ کھانا کھلاتی ہیں۔ پہلے یہ کھانا ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے پھر اخبار پر دیا جاتا ہے پھر پلیٹ میں اور آخر میں منوا کا داخلہ گھر میں ہو جاتا ہے۔ مسز ملکانی اسے دیکھ کر، اسے کھلا کر، اپنے پاس بلا کر، اپنے ممتا کے جذبے کو تسکین پہنچاتی ہیں۔ ان کے دل میں یہ خواہش بھی جنم لیتی ہے کہ کسی طرح وہ منوا کو اپنا لیں۔ منوا کو نہلا دھلا کر ڈائننگ ٹیبل

پر بٹھا کر، خوشبو میں نہا کر وہ اسے اپنے جیسا بنانا چاہتی ہیں مگر منوا اس خوشبو کے جھونکے کو برداشت نہیں کر پاتا اور کھانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ اسی طرح منوا کے برتاؤ میں بھی تبدیلی رفتہ رفتہ زینہ بہ زینہ ہی آتی ہے۔ پہلے وہ ڈرتا ہے۔ پھر جھجھکتا ہے، پھر قریب آتا ہے۔ پہلے وہ للچائی نظروں سے دیکھتا ہے، پھر اسے کھانے کا انتظار رہنے لگتا ہے اور بعد میں وہ وقت پر حاضر ہونے لگتا ہے۔ دونوں کے ملن کے محسوسات بھی الگ الگ ہیں۔ منوا مسز ملکانی کی جانب اپنی شکم پری کی وجہ سے متوجہ ہوتا ہے اور مسز ملکانی اپنے جذبۂ ممتا کی تشنگی کو بجھانے کی خاطر۔ دونوں کی قربت خاص غرض سے ہوتی ہے مگر دونوں ایک دوسرے کی غرض سے ناواقف رہتے ہیں یا ناواقف رہتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ معاملہ خواہ جو بھی ہو احمد صغیر نے ان دونوں کرداروں کو فطری جذبے کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہوتے دکھایا ہے جو کہانی کا تقاضہ بھی ہے۔ احمد صغیر مسز ملکانی سے منوا کو ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکتے ہوئے بھی دکھا سکتے تھے اور منوا کو مسز ملکانی کو دیکھتے ہی بھاگتے ہوئے بھی دِکھا سکتے تھے۔ مگر اس سے کہانی کا فطری ارتقاء اور فنّی تقاضہ پورا نہیں ہوتا۔ احمد صغیر کا یہ عمل انتہائی فنکارانہ ہے۔

منظر نگاری اور Situations کے امتزاج سے احمد صغیر نے اس کہانی کا تانا بانا اس طرح بنا ہے کہ پلاٹ گٹھیلا ہو گیا ہے کہیں سے کوئی چول ڈھیلی پڑتی نظر نہیں آتی۔ واقعات کی ترتیب و تنظیم بڑی ہوشمندی سے کی گئی ہے اور مکالمے کو اس قدر چست اور درست رکھا گیا ہے کہ کہیں سے کوئی انگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں رہتی ہے (حالانکہ مکالمہ بہت کم ہے)۔ واقعات کے تسلسل سے بیانیہ کو زوردار بنایا گیا ہے۔ کہانی کے اختتام پر مجھ جیسے قاری کو دونوں کرداروں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ منوا سے ہمدردی تو فطری ہے مگر مسز ملکانی سے اس کے رویہ اور برتاؤ کی وجہ سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ منوا کے ساتھ مسز ملکانی کا رویہ بے غرض نہیں مگر یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ منوا کا جھکاؤ بھی بر بنائے خلوص نہیں مگر یہ ساری باتیں اندر کی ہیں، باہر کی بات تو یہ ہے ایک امیر زادی غریب بچے کی جانب نگاہ خلوص و ہمدردی سے دیکھتی ہے۔ جو آج کے معاشرے کا کھلا ہوا تضاد ہے۔ مگر اسی تضاد سے احمد صغیر نے کہانی میں فنکارانہ حسن پیدا کیا ہے۔

احمد صغیر کی کہانیوں کا عام موضوع معاشرہ، سماج اور ارد گرد کا ماحول ہوا کرتا ہے۔ احمد صغیر اپنی کہانیوں میں پسماندہ، محروم اور مظلوم و مجبور طبقے کو زبان دیتے نظر آتے ہیں۔ سو اس کہانی میں بھی ان کا یہی رویہ برقرار ہے۔

یہ کہانی آج کے ترقی یافتہ، مہذب سماج کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے اور حکمرانوں کے لئے عبرتناک سبق۔ احمد صغیر کی یہ کہانی اپنے اختتام پر یہی کہتی نظر آتی ہے کہ ؎

شائد کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات

اور آخری بات ''تعفن'' استعارہ ہے ہمارے سڑے ہوئے سماج کا جو کوڑے کی ڈھیر کی طرح ہے اور منوا اس تعفن زدہ سماج کا ایک آئینہ ہے اور مسز ملکانی اس آئینہ کا وہ کنارہ جو نظر نہیں آتا ہے مگر آئینہ کا حصہ ہی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اشھد کریم الفت

''درمیاں کوئی تو ہے'' احمد صغیر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے۔اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' اور ''انا کو آنے دو'' شائع ہو کر اہل علم و ادب اور دانشورانِ فکر و نظر سے داد و تحسین کی سند حاصل کر چکے ہیں۔اس لیے احمد صغیر کا نام افسانہ نگاری کے لیے خاصا جانا پہچانا ہے۔

1980ء کے بعد فکشن میں افسانہ نگاروں کی جو نئی نسل ابھر کر سامنے آئی ہے ان میں احمد صغیر اپنی انفرادی شناخت حاصل کر چکے ہیں اور ان کا نام نمایاں طور پر جلی حرفوں میں سب سے جدا نظر آتا ہے۔

احمد صغیر زمین سے جڑی ہوئی باتوں پر یقین رکھتے ہیں آسمانی خلاء میں قلابازیاں نہیں لگاتے۔اپنی کہانیوں کے تانے بانے زمینی مسائل اور ان میں بھی اپنے ارد گرد وقوع پذیر ہونے والے حادثات و سانحات ہی سے نت نئے کردار چنتے ہیں۔جو اجنبی نہیں لگتے ہیں بلکہ ہم ان سارے چہروں سے آشنا ہوتے ہیں۔یہ نکسل واد سے بہت متاثر ہیں۔ان کے دکھوں میں ڈوب کر انہوں نے ''انا کو آنے دو'' کو تلاش کیا ہے جو سماج میں احتجاج اور بدلاؤ کا کامیاب اشاریہ ہے۔

''درمیاں کوئی تو ہے'' میں کل ۱۴ افسانے شامل ہیں جو مختلف نوعیت کے حامل ہیں مگر سارے افسانے تیسرے کردار پر منحصر ہیں۔چاہے انسان برائی کی راہ پر گامزن ہو یا اچھائی کی راہ پر۔ان افسانوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ دو فریق کے درمیان کوئی تیسری طاقت موجود ہے جو اس کی حامی و مددگار ہے۔اس لیے ''درمیاں کوئی تو ہے'' اپنے تبلیغ کی ترسیل ہے جس میں زندگی کو جیتی جاگتی علامتیں موجود ہیں جو انسان کو بے انتہا قوتوں سے نوازتی ہوئیں محسوس ہوتی ہیں۔اس مجموعے کا آخری افسانہ ''حیثیت'' جس میں بڑے شہر کی خود غرض زندگی اور بے مروت حالات کی جھوٹی شان و شوکت کی بھول بھلیاں میں گم اپنے والدین کے فرائض سے بے خبری کو برتا گیا ہے۔ضعیف العمر دین دیال جی کی حیثیت اپنے بیٹے کے مکان میں ہی ایک نوکر سے بدتر کی ہو جاتی ہے جس کا احساس ان کے بیٹے اور بہو کو ذرا برابر بھی نہیں ہے مگر فرشتہ صفت معصوم پوتا بنٹی جو کہ نا سمجھی کی عمر میں ہوتے ہوئے بھی ان کے دکھ درد کو سمجھتا ہے لیکن بے حس بیٹا اور بہو جان بوجھ کر اپنے فرض کی انجام دہی سے بیگانے نظر آتے ہیں جب دین دیال جی اپنے گاؤں جانے کے لئے فیصلہ کرتے ہیں۔تو جو بہو شہر آنے کے وقت ان سے مطمئن نہیں تھی اب وہی بہو ان کے گاؤں جانے سے خوش نظر نہیں آتی ہے کیونکہ ان کے رہنے سے نوکر کی کمی پوری ہو جاتی ہے اور اولاد جو کہ والدین کی ضعیفی میں راحت کی آس ہوتی ہے وہ بھی اپنی خود غرضی کی دنیا میں اپنے فرائض سے چشم پوشی اختیار کرتی ہے۔اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جو ان تمام حالات کی عکاسی کرتا ہے۔

''لگتا ہے پتا جی کو یہاں ضرور کوئی تکلیف ہوئی ہے''———وشاکھا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں بہو تکلیف کس بات کی مگر کیا ہے کہ پتہ نہیں کیوں گاؤں بہت یاد آ رہا ہے اس لیے جانا چاہتا ہوں اگر وہاں بھی دل نہیں لگا تو پھر واپس آ جاؤں گا۔آخر تم لوگوں کے علاوہ میرا اس دنیا میں اور کون ہے۔''

''دادا! مجھے لگ رہا ہے آپ واپس نہیں آئیں گے۔بنٹی جو بہت دیر سے سب کی باتیں سن رہا تھا اچانک بیچ میں بول

پڑا۔

''کیوں بنٹی کیوں؟ دین دیال نے اپنے پوتے کی طرف دیکھا۔''

''کیوں کہ بازار کا چکر لگاتے لگاتے آپ بہت تھک گئے ہیں——''

(درمیاں کوئی تو ہے۔صفحہ۔138)

یقیناً اس اقتباس میں بدلتے دور کا اور ترقی یافتہ سماج کا ایک المیہ ہے جو ہمیں پل بھر کے لیے سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہماری فکر اور سمجھ ایک بچے سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔

پہلا افسانہ ''درمیاں کوئی تو ہے'' مذہبی منافرت پھیلانے والوں کے مختلف نقوش کی عکاسی کرتا ہے ''تعفن'' میں نفسیات کی بہترین پیش کش ملتی ہے۔ ''پناہ گاہ'' میں بھروسے اور اعتقاد کی دیوار دیں زمیں بوس نظر آتی ہیں۔ ''سوانگ'' میں مختلف کردار موجود ہیں مگر ''نینا کا روپ'' کچھ اور ہی تاثر پیش کرتا ہے۔ ''فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی'' نکسلی موومینٹ کی ترجمانی کرتا ہے۔ کامریڈ کی شکل میں نسوانی احتجاج کے گرد و غبار اُٹھتے ہیں کار و مانجھی کے کردار میں بھی نکسل واد کو تقویت ملتی ہے۔

غرض ''درمیاں کوئی تو ہے'' میں تمام افسانے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انسانی دل و دماغ پر ان کے نقش دیرپا قائم رہتے ہیں۔

●●

تعارف

نام : محمد صغیر

قلمی نام : احمد صغیر

والدین : محمد حنیف (مرحوم)، ساجدہ خاتون

پیدائش : ۲۱؍نومبر ۱۹۶۳ء

مولد : محلّہ گیوال بیگھہ، گیا (بہار)

تعلیم : پی ایچ۔ڈی (اُردو)

ملازمت : انوگرہ میموریل کالج، گیا

اہلیہ : نزہت پروین

اولادیں : التمش صغیر
فرجاد صغیر

دیگر کتابیں :

- نئی کہانی نیا مزاج (انتخاب اور تجزیہ) 1989
- چھ دسمبر (بابری مسجد پر لکھی گئی نظموں کا انتخاب) 1993
- منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانوی مجموعہ) 1995
- انّا کو آنے دو (افسانوی مجموعہ) 2001
- جنگ جاری ہے (ناول) 2002
- چنگاریوں کے درمیان (غزلیں — ہندی) 2002
- اردو افسانے میں احتجاج (تحقیقی مقالہ) 2003
- درمیاں کوئی تو ہے (افسانوی مجموعہ) 2007
- دروازہ ابھی بند ہے (ناول) 2008

- اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (۱۹۸۰ء کے بعد) 2009
- ایک بوند اُجالا (ناول) 2013

تراجــــم :

- بے شناخت (اردو سے ہندی) ناصر بغدادی
- تلاش بہاراں* (اردو سے ہندی) کشوری لال نسیم
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) اکبر الہٰ آبادی
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) شکیب جلالی
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) خواجہ میر درد

[*یہ چاروں کتابیں رادھا کرشن پرکاش، نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہیں]

اعزاز و انعام :

- منڈیر پر بیٹھا پرندہ (بہار اردو اکادمی) ۱۹۹۵
- انّا کو آنے دو (مغربی بنگال اردو اکادمی) ۲۰۰۱
- جدید اردو افسانوں میں (دہلی اردو اکادمی) ۲۰۰۳
- درمیاں کوئی تو ہے (عظیم آبادی ایوارڈ‘ بہار اُردو اکادمی) ۲۰۰۷
- جدید اردو افسانوں میں۔ (بہار اردو اکادمی) ۲۰۰۳
- اُردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (اتر پردیش اردو اکادمی) ۲۰۰۹

●●

احمد صغیر کی دو اہم تنقیدی کتابیں

بہار میں اُردو فکشن

ایک تنقیدی مطالعہ

اور

اُردو ناول کا تنقیدی جائزہ

1980 کے بعد